\makhzan\pictu
for
4\shahnaz\5.jpg
not found.

عنایت اللہ

خطبہ استقبالیہ

مہمان خصوصی محترم محمد میاں سومرو صاحب، چیئرمین سینٹ پاکستان،

صدر مجلس جناب جمیل جالبی صاحب،

خواتین و حضرات، السلام علیکم۔

''مخزن'' کی مجلسِ ادارت کی طرف سے میں آپ سب کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ میں محمد میاں سومرو صاحب کا خاص طور پر شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود ہمارے لیے قیمتی وقت نکالا اور اس اہم کانفرنس میں شرکت فرمائی۔

صاحب صدر! ۳۴ برس ہونے کو آئے ہیں کہ آئین پاکستان کی ہدایت کے باوجود ہماری قومی زبان اردو کو ابھی تک سرکاری زبان کا درجہ نہیں مل سکا۔ اردو زبان کی اہمیت اور قبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ پاکستان (بلکہ ہندوستان) کے ہر صوبے اور علاقے نے اس کی پیدائش پر اپنا حق جتایا ہے۔ اور تحقیق سے ثابت کرنے کی سعی کی ہے کہ یہ سدا بہار اور دل آویز زبان ان کے علاقے کی پیداوار ہے۔ پھر یہ بھی کہ اردو اور دوسری پاکستانی زبانوں کا آپس میں ایک تاریخی اور کلچرل رشتہ ہے اور ان میں بہت سے الفاظ مشترک ہیں۔

صاحب صدر! ساری دنیا میں جہاں جہاں اس برّ اعظم کے باسی رہائش پذیر ہیں، اردو زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ خاص طور پر مشرقِ وسطیٰ، افغانستان، امریکہ اور یورپ میں شاید ہی کوئی مہینہ ایسا گزرتا ہو جب ان جگہوں سے کوئی اردو کی نئی کتاب یا مشاعرے کے بارے میں خبر نہ آتی ہو۔ اگر جاپان، چین، کوریا اور روس ہر کام کے لیے اپنی زبان کو ذریعۂ اظہار بنا سکتے ہیں اور بناتے ہیں اور اپنی زبان پر فخر کرتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اس میدان میں ہم پیچھے رہیں اور تساہل سے کام لیں۔

مجلّہ ''مخزن'' سر عبدالقادر نے ۱۹۰۱ء میں نکالا تھا اور اردو رسالوں کے لیے ایک نئے اور اعلیٰ معیار کی نیو ڈالی تھی۔ یہ اعزاز قائداعظم لائبریری اور حکومت پنجاب کو ملا کہ ٹھیک سو سال کے بعد ''مخزن'' باغ جناح لاہور سے جاری ہوا۔ اور اب تک اس کے ۱۲ شمارے چھپ چکے ہیں۔ میں مدیر مخزن ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے ہمت اور محنت سے کام لیتے ہوئے اس شمع کو جلائے رکھا۔

محترم محمد میاں سومرو صاحب! میں اپنے استقبالیہ کلمات ختم کرتے ہوئے ''مخزن'' کا ایک مجموعہ آپ کو پیش کرتا ہوں اور امید رکھتا ہوں کہ آپ اپنے بلند پایہ منصب کو بروئے کار لاتے ہوئے، حکومت پاکستان کو اس بات پر قائل کریں گے کہ اردو کو سرکاری زبان بنانے میں مزید تاخیر نہ کی جائے۔ انگریزی اور علاقائی زبانوں کی اہمیت سے کوئی پاکستانی انکار نہیں کر سکتا، مگر قومی زبان کے

اپنے تقاضے ہیں اور آئین کے مطالبے کو پورا کرنا ہم سب کا فرض ہے۔

آخر میں ایک دفعہ پھر میں جناب محمد میاں سومرو صاحب کا، صاحب صدر جناب جمیل جالبی صاحب کا، ہر صوبے سے آئے ہوئے اہل قلم اور حاضرین کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

میں مجلس ادارت کے اراکین ڈاکٹر وحید قریشی، انتظار حسین، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر انور سدید، امجد اسلام امجد اور ڈاکٹر طاہر تونسوی کا شکرگزار ہوں کہ انھوں نے ''مخزن'' کے اجرا اور تسلسل میں ہماری مدد فرمائی۔ میں ڈائریکٹر جنرل پبلک لائبریریز پنجاب جناب ڈاکٹر منصور احمد باجوہ اور چیف لائبریرین قائداعظم لائبریری محمد تاج صاحب، شہزاد احمد صاحب ڈائریکٹر مجلس ترقی ادب۔ شہناز مزمل صاحبہ لائبریرین قائداعظم لائبریری اور ان کے رفقائے کار کا بھی شکرگزار ہوں کہ انھوں نے اس کانفرنس کو کامیاب بنانے میں ہمارے ساتھ بھرپور تعاون کیا۔

اردو پاکستان کی قومی زبان ہے

آئین پاکستان کا آرٹیکل 251

251. National language--(1) The National language of Pakistan is Urdu, and arrangements shall be made for its being used for official and other purposes within fifteen years from the commencing day.

(2) Subject to clause (1), the English language may be used for official purposes until arrangements are made for its replacement by Urdu.

(3) Without prejudice to the status of the National language, a provincial Assembly may by law prescribe measures for the teaching, promotion and use of a provincial language in addition to the national language.

۲۵۱۔ قومی زبان ۔۔(۱) پاکستان کی قومی زبان اردو ہے۔ اسے سرکاری اور دیگر مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے لیے آئین کے نفاذ سے پندرہ سال کے اندر انتظامات کیے جائیں گے۔

(۲) پہلی شق کے مطابق اردو کو انگریزی کی جگہ لینے کا انتظام کرنے تک انگریزی کو سرکاری زبان کے طور پر استعمال کیا جائے گا۔

(۳) قومی زبان کے مقام کے خلاف کسی قسم کے تعصب کے بغیر ایک صوبائی اسمبلی کو حق حاصل ہوگا کہ وہ قومی زبان کے ساتھ ساتھ صوبائی زبان کی ترقی، استعمال اور تعلیم کے لیے مناسب قوانین بنا سکے۔

E:\makhzan\picture for 14\shahnaz\3.jpg not found.

محمد میاں سومرو

جناب محمد میاں سومرو چیئرمین سینٹ پاکستان کا خطبہ

جناب جمیل جالبی صاحب، جناب عنایت اللہ صاحب، امجد اسلام امجد صاحب

تمام صوبوں سے آئے ہوئے اہل قلم و دانشور خواتین و حضرات!

ہم سب یہاں اس مقصد کے لیے جمع ہوئے ہیں کہ پاکستان میں فروغ اردو کے بارے میں چاروں صوبوں کے دانشوروں، ادیبوں اور ماہرین لسانیات کے خیالات سنیں قومی زبان کی گزشتہ نصف صدی کے دوران ترقی کا جائزہ لیں اور پاکستان میں اردو کے مستقبل کو تاباں و درخشاں بنانے اور قومی مقاصد کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کے لیے اجتماعی لائحۂ عمل پر غور کریں۔

خوش آیند بات یہ ہے کہ اس کانفرنس کے انعقاد کی ضرورت اردو ادب کے ممتاز مجلّہ ''مخزن'' کی مجلس ادارت نے محسوس کی جو قائداعظم لائبریری لاہور کا ادبی نمائندہ ہے اور ۱۰۱ء سے فروغ اردو اور مطالعۂ کتب کے علاوہ تحقیق و تنقید میں گراں مایہ خدمات انجام دے رہا ہے۔ ''مخزن'' کا ذکر آیا ہے تو مجھے سر عبدالقادر (مرحوم) یاد آئے۔ جنھوں نے ۱۹۰۱ء میں لاہور سے ''مخزن'' جاری کیا اور اس رسالے کو اس دور میں جدیدیت اور روشن خیالی کا مظہر بنا دیا۔ اس کے پہلے پرچے میں نہ صرف اقبال کی نظم ''ہمالیہ'' شائع کی بلکہ ہندوستان کے بیشتر نامور ادیبوں کو ''مخزن'' میں اظہار خیال پر آمادہ کیا۔ شیخ عبدالقادر کی عطا یہ بھی ہے کہ انھوں نے علامہ اقبال کو شاعری جاری رکھنے کا مشورہ اس وقت دیا جب وہ لندن میں شاعری ترک کرنے کا ارادہ کر چکے تھے۔

قائداعظم لائبریری کے رسالہ ''مخزن'' کا مزاج زمانی ضرورت کے مطابق مختلف ہے۔ لیکن اس کی اردو دوستی مسلّم ہے جس کے لیے میں ''مخزن'' کے صدر مجلس جناب عنایت اللہ اور مدیر اعزازی ڈاکٹر وحید قریشی اور مجلس ادارت کے ارکان انتظار حسین، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر انور سدید، امجد اسلام امجد، ڈاکٹر طاہر تونسوی اور قائداعظم لائبریری کے بورڈ آف گورنرز کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

خواتین و حضرات!

اردو خالصتاً برصغیر پاک و ہند کی زبان ہے جس نے لالۂ خودرو کی طرح قدرتی طور پر جنم لیا۔ اردو زبان کی اساس ہندوستان کے وسیع و عریض خطے کی مقامی زبانیں قرار دی جاتی ہیں لیکن اس کے خمیر میں فارسی اور عربی کا عمل دخل بھی ہے۔ علامہ سلیمان ندوی نے اپنی کتاب ''نقوش سلیمانی'' میں لکھا ہے:

"جس کو آج ہم اردو کہتے ہیں اس کا ہیولی وادیِ سندھ میں تیار ہوا ہوگا۔"

اس نظریے کی دلیل یہ ہے کہ دوسری اور تیسری صدی ہجری میں خلافتِ اسلامیہ کے ساتھ سندھ کے علمی، تجارتی، تمدنی اور سیاسی تعلقات قائم تھے۔ پیر سید حسام الدین راشدی کے مطابق سلطان محمد تغلق اور فیروز تغلق نے سومروؤں کے صدر مقام "ٹھٹھہ" پر فوج کشی کی تو اس وقت سندھ کی عام زبان اردو تھی۔ علامہ آئی، آئی قاضی کی تحقیق کے مطابق تو لفظ "اردو" ترکی زبان سے نہیں لیا گیا بلکہ یہ آریاؤں کے ساتھ اس خطے میں آیا تھا۔

صوبہ سرحد کے ادیب فارغ بخاری نے پشتو کو ہندوستان کی قدیم ترین زبان اور اس علاقے کی تہذیب کو قدیم ترین تہذیب قرار دے کر کہا ہے کہ ہندوستان پر تمام یلغاریں شمال مغرب کی طرف سے ہوئی تھیں، جن میں شامل لشکروں نے ایک نئی زبان کا ریختہ تیار کیا جس کے اثرات پورے ہندوستان میں پھیلے۔

حافظ محمود شیرانی نے پنجاب کو اردو زبان کا سرچشمہ قرار دیا اور کہا کہ اردو دہلی کی قدیم زبان نہیں ہے بلکہ یہ زبان مسلمانوں کے ساتھ دہلی جاتی ہے۔ ایس۔ کے چیٹر جی نے بھی اردو زبان کے فروغ کو عوام کے میل ملاقات، نقل و حرکت اور باہمی کاروبار سے متعلق کرتے ہوئے کہا ہے کہ ترک فاتحین کے ساتھ پنجابی مسلمان دہلی میں اپنی وہ بولی بولتے ہوئے آئے جو شمال مغربی علاقوں کی بولی سے حد درجہ مشابہت رکھتی ہے۔

خواتین و حضرات! دلچسپ بات یہ ہے کہ نصیر الدین ہاشمی نے قدیم اردو کا سراغ ارضِ دکن میں لگایا۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اس زبان کا رشتہ پراکرتوں سے قائم کیا۔ ڈاکٹر سہیل بخاری نے مہاراشٹری زبان کو اردو کا ماخذ قرار دیا۔ عین الحق فرید کوٹی نے اردو زبان کا پیوند دراوڑی زبان سے جوڑا۔ مجموعی طور پر یہ کہنا مناسب ہے کہ برصغیر کی مشترکہ زبان اردو میں متعدد الفاظ، بولیاں اور لہجے شامل ہیں۔ اور یہ بات بھی واضح ہے کہ مقامی بولیوں کا مدار محدود ہے لیکن اردو زبان کی بستیاں پوری دنیا میں قائم ہو چکی ہیں۔ اس کا منفرد کردار یہ بھی ہے کہ اس زبان نے تقسیم سے قبل برصغیر کے مسلمانوں میں قومی یک جہتی پیدا کرنے اور انھیں علیحدہ قومیت کا احساس دلانے میں اہم کردار ادا کیا۔

سرسید احمد خان نے ۱۸۶۷ء میں ہی یہ الفاظ کہے تھے:

"مجھے یقین ہے کہ اب ہندو مسلمانوں کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا محال ہے۔ جو زندہ رہے گا وہ دیکھے گا"۔

چنانچہ یہ کہنا درست ہے کہ پاکستان کے قیام میں مذہبی، اقتصادی اور معاشرتی وجوہ کے علاوہ "اردو زبان" کا عمل دخل بھی تھا جو مسلمانوں کی زبان شمار ہوتی تھی۔ اور عربی کے اسلامی رسم الخط کے مطابق دائیں سے بائیں جانب لکھی جاتی تھی۔ قائد اعظم نے اسے قومی یک جہتی اور ثقافتی رابطے کی زبان کے طور پر قبول کیا اور مشرقی پاکستان، پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان میں مختلف مضبوط علاقائی زبانوں کی موجودگی میں ۱۹۴۸ء میں فرمایا کہ "پاکستان کی قومی زبان اردو اور صرف اردو ہوگی"

خواتین وحضرات! سندھ کا ذکر تو میں پہلے کر چکا ہوں جس کو سید سلیمان ندوی، علامہ آئی آئی قاضی اور پیر حسام الدین راشدی اردو کا مولد قرار دے چکے ہیں۔ صوبہ سندھ خطہ "اردو" کا تاریخی وارث بھی ہے۔ اور میں یہ کہنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ قائداعظم نے تشکیلِ پاکستان کے لیے اردو سے کام لیا تھا اور برصغیر کے مسلمانوں میں یک جہتی پیدا کی تھی۔

اب اس زبان کو ۱۹۷۳ء کے آئین میں 'قومی زبان' کا مقام مل چکا ہے۔ اس کے نفاذ کا لائحہ عمل بھی طے شدہ ہے۔ لیکن انگریزی زبان کی ضرورت اور بین الاقوامی حیثیت کی وجہ سے قومی زبان کے نفاذ کے رسمی اعلان میں تاخیر ہو رہی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اردو چاروں صوبوں میں رابطے کی زبان ہے۔ جس میں قومی اور بین الاقوامی الفاظ کو سمیٹنے کی صلاحیت بے پایاں ہے اور جس کا ذخیرۂ الفاظ روز افزوں ہے۔ قومی سطح کے راہنما اردو میں خطاب کرتے ہیں۔ قومی اسمبلی، سینٹ اور صوبائی اسمبلیوں میں اراکین زیادہ تر اردو میں استدلال کرتے ہیں۔ سب سے زیادہ اخبارات و رسائل اردو میں شائع ہوتے ہیں۔ چاروں صوبوں میں اردو نصاب، تمام مدارج پر نافذ ہے۔ اہم بات یہ کہ صوبائی زبانوں کی اکادمیاں چاروں صوبوں میں یکساں آزادی سے کام کر رہی ہیں۔ ان کا آپس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ان حقائق کی موجودگی میں بھی انگریزی کو امتیازی مقام حاصل ہے۔

خواتین وحضرات! میں قوم کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ صدر جنرل پرویز مشرف اور وزیراعظم شوکت عزیز کی حکومت نفاذِ اردو سے غافل نہیں اور اس کی آئینی حیثیت کے تحت اسے نافذ کرنے میں بھی سنجیدہ ہے۔ چنانچہ اردو کو دفتری اور عدالتی زبان کے طور پر اختیار کرنے کے لیے وزیراعظم شوکت عزیز کی قائم کردہ کمیٹی کا ایک اجلاس گزشتہ دنوں اسلام آباد میں منعقد ہوا جس میں بہت سی دور رس اور نتیجہ خیز سفارشات مرتب کی گئی ہیں۔ ان سفارشات کو تجزیہ نگاروں اور اداریہ نویسوں نے معقول اور برمحل قرار دیا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ زبان صرف اظہار اور لین دین کا وسیلہ اور ربط و تعلق کا ذریعہ ہی نہیں ہوتی بلکہ کسی قوم کی روایات، تہذیب اور کلچر کی آئینہ دار بھی ہوتی ہے۔ انگریزی زبان عالمی زبان بن چکی ہے۔ بلاشبہ یہ ہماری ایک ضرورت بھی ہے لیکن انگریزی ہماری روح میں اتر نہیں سکتی، نہ ہماری روایات کی پاسبان بن سکتی ہے۔ اس لیے اس کا حصول صرف کاروباری، تحقیقی اور سائنسی علوم و فنون کے تقاضوں تک محدود رکھا جائے اور ان طالب علموں کو جو کسی شعبے میں سپیشلائزیشن کرنا یا انگریزی زبان و ادب میں تخصص کے خواہش مند ہیں، مناسب سہولتیں فراہم کی جائیں۔ دنیا کی تمام اقوام میں یہی طریق رائج ہے اور ہمیں بھی یہی طریق اختیار کرنا چاہیے۔ شکریہ

پاکستان زندہ باد

nakhzan\pict
for
\shahnaz\7.j
not found.

ڈاکٹر جمیل جالبی

پاکستان میں اردو کا مستقبل

"پاکستان میں اردو کا مستقبل" ایک دلچسپ و اہم موضوع ہے اور اس لیے بھی اہم ہے کہ یہ مایوس نہیں کرتا بلکہ خوابِ غفلت سے ہمیں بیدار کرتا ہے۔ غفلت زندگی کا منفی پہلو ہے اور بیداری مثبت پہلو ہے۔ گویا یہ موضوع ہمیں سوچنے اور غور و فکر کرنے کی دعوت دیتا ہے۔

آپ کو یاد ہوگا کہ جب برطانوی سامراج کے خلاف تحریک آزادی نے زور پکڑا اور تحریک پاکستان بھی تحریک آزادی میں شامل ہوگئی تو جس زبان نے سارے برصغیر کی سطح پر، آزادی و پاکستان کی تحریک کا پیغام نیچے سے اوپر تک پہنچایا اور ذہنی طور سے تیار کیا وہ اردو زبان تھی اور اسی لیے جب پاکستان وجود میں آیا تو روحِ پاکستان حضرت قائداعظم نے، پورے اعتماد کے ساتھ، ڈھاکا میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

> "جہاں تک آپ کی بنگالی زبان کا تعلق ہے، اس افواہ میں کوئی صداقت نہیں ہے کہ آپ کی زندگی پر کوئی غلط یا پریشان کن اثر پڑنے والا ہے۔ بالآخر اس صوبے کے لوگوں کو ہی حق پہنچتا ہے کہ وہ فیصلہ کریں کہ اس صوبے کی زبان کیا ہوگی لیکن یہ میں آپ کو واضح طور پر بتا دینا چاہتا ہوں کہ پاکستان کی سرکاری زبان اردو ہوگی اور صرف اردو...... جو کوئی آپ کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے، وہ پاکستان کا دشمن ہے۔ ایک مشترک سرکاری زبان کے بغیر کوئی قوم متحد نہیں ہو سکتی، نہ کوئی کام کر سکتی ہے۔ دوسرے ملکوں کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجیے۔"

خواتین و حضرات! آپ نے غور فرمایا کہ قائداعظم، جن کی زبان انگریزی تھی اور وہ اردو سے ناواقف تھے، انگریزی کو پاکستان کی قومی زبان بنانے کے لیے کیوں نہیں کہا۔ وہ چاہتے اور اسے پاکستان اور اس کے مستقبل کے لیے مفید و اہم اور ضروری سمجھتے تو وہ یقیناً انگریزی کو سرکاری زبان بنا دیتے لیکن اس کے برخلاف انھوں نے فرمایا کہ "ایک مشترک سرکاری زبان کے بغیر کوئی قوم متحد نہیں ہو سکتی، نہ کوئی کام کر سکتی ہے۔" پاکستان کو ایک زندہ، جیتی جاگتی قوم بنانے، اسے متحد کرنے اور یک جہتی کے رشتے میں پیوست کرنے کے لیے یہی وہ راستہ تھا جو ہمیں اختیار کرنا چاہیے تھا اور جسے اختیار نہ کرنے کی وجہ سے ہم آج تک بکھرے ہوئے ہیں جب کہ پاکستان کو وجود میں آئے ماشاءاللہ ساٹھ برس ہو گئے ہیں۔

ہماری صورت حال یہ ہے کہ ہم نے اس راستے ہی کو ترک کر دیا ہے اور انگریزی زبان کی خیالی افادیت کے جھوٹے جادو کی گرفت میں اس طرح آ گئے ہیں کہ جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا ہے ہم پاکستان کو اپنی زبان سے دور کرتے جاتے ہیں اور اسی وجہ سے آج تک مسلسل اور تواتر کے ساتھ تھکا دینے والے مسائل اور انتشار کا شکار ہیں۔ اور ضرورت ہے کہ ہم اس انتشار کے بنیادی اسباب کو تلاش کریں کہ یہ ملک، جسے طویل جد و جہد اور عظیم قربانیوں کے بعد حاصل کیا ہے، کیوں یک جہتی کے رشتے میں پیوست ہو کر ترقی کی راہ پر نہیں چل سکا ہے، جب کہ ہمارے بعد آزاد ہونے والے ممالک ہم سے کہیں آگے نکل کر، اپنے سیاسی، تہذیبی، معاشرتی اداروں کے ساتھ آج مستحکم بنیادوں پر کھڑے ہیں اور ایک ہم ہیں کہ اب تک ایسا نظام بھی وضع نہیں کر سکے ہیں جو عدل و انصاف پر قائم ہو۔ جس میں عوام و خواص سب برابر کے شریک ہوں، جہاں قانون کی حاکمیت و بالادستی سب کے لیے یکساں ہو، جہاں اہلیت کی بنیاد پر آگے بڑھنے کے مواقع سب کو میسر ہوں، جہاں ایک طبقہ ساری آبادی اور عوام کا استحصال نہ کر رہا ہو، جہاں قدرت کی دی ہوئی نعمتوں سے سب یکساں طور پر مستفیض ہو رہے ہوں، جہاں نا انصافیاں، ظلم و جبر کو پروان نہ چڑھا رہی ہوں، جہاں یکساں نظام تعلیم کے یکساں مواقع سب کو میسر ہوں، جہاں نظام تعلیم قومی تقاضوں کے مطابق وضع کیا گیا ہو۔ یہ وہ صورت حال ہے جس سے ہم مسلسل نبرد آزما ہیں اور ہر روز، جب صبح کا نیا سورج طلوع ہوتا ہے، ہم انتشار کے گرداب میں اور زیادہ پھنس جاتے ہیں اور عوام مزید احساس محرومی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ آج اس کا علاج صرف اور صرف یہ ہے کہ ہم خلوص دل سے "قومی سوچ" کے ساتھ قوم کے بڑے اور بنیادی مسائل پر غور کریں اور ایسے فیصلے کریں جن سے پاکستانی قوم کو ترقی کے راستے پر آگے بڑھانے کا راستہ مل سکے۔ ان بڑے فیصلوں میں ایک فیصلہ سیاسی نظام کا ہے۔ دوسرا بڑا فیصلہ یکساں نظام تعلیم کا ہے، تیسرا بڑا فیصلہ ان اقدار کا ہے جن پر ہمیں اپنی فکر اور نظام کی بنیاد رکھنی ہے، چوتھا بڑا فیصلہ معاشی انصاف کا ہے، ایسا معاشی انصاف جس میں معاشرے کا ہر طبقہ پوری طرح شریک ہو، پانچواں بڑا مسئلہ، جو ان سب فیصلوں کے لیے سب سے بنیادی اہمیت رکھتا ہے "قومی زبان" کا ہے جس کے بارے میں ہم ہر روز نئے نئے شکوک و شبہات پیدا کرنے میں معروف عمل ہیں اور جس کی وجہ سے قائد اعظم لائبریری کے ارباب حل و عقد کو "پاکستان میں اردو زبان کا مستقبل" کے موضوع پر سیمینار کی ضرورت محسوس ہوئی جس کے لیے وہ میری طرف سے دلی مبارک باد کے مستحق ہیں۔

یاد رہے کہ مشہور فرانسیسی مستشرق اور اردو داں گارساں دتاسی نے لکھا تھا کہ:

> "قوموں میں کوئی چیز اس قدر اختلاف پیدا نہیں کرتی جتنا یہ کہ ان کی زبانیں مختلف ہوں اور کوئی چیز اتنا اتحاد و یگانگت پیدا نہیں کرتی جتنی کہ ایک مشترک زبان۔ یہ حقیقت اس قدر عیاں ہے کہ اس کے لیے کسی مثال کی ضرورت نہیں"۔

اگر گارساں دتاسی کی اس بات کو ہم پاکستان کے تعلق سے دیکھیں تو اس کی معنویت ہمارے سامنے واضح ہو جائے گی۔ ہماری قومی زبان ہمارے وفاق کی علامت ہے، ہماری قومی شناخت ہے، قومی زندگی کی ہر سطح پر ہماری ضرورت ہے۔ اس کے بغیر ہم انگریزی کے ذریعے عوام تک نہیں پہنچ سکتے لیکن انگریزی کی خیالی افادیت نے ہمیں اس طرح اپنی گرفت میں لے رکھا ہے کہ ہم صرف اسے، اپنے لیے راہ نجات سمجھ رہے ہیں۔ انگریزی زبان پڑھنا، سیکھنا، اس پر عبور حاصل کرنا ایک بات ہے اور اسے ساری زندگی کے لیے اوڑھنا بچھونا بنانا ایک بالکل مختلف اور منفی بات ہے۔ انگریزی پڑھنے اور سیکھنے کی کوئی ذی ہوش مخالفت نہیں کرتا لیکن جس طرح ہم

انگریزی کو اوڑھے اور خود کو اس میں لپیٹے ہوئے ہیں، اس کا نتیجہ وہی نکلتا ہے جواب تک نکلا اور جس نے ہماری تخلیقی صلاحیتوں کو کمزور اور دو نیم کر دیا ہے اور ہم ایک تیسرے درجے کی بے مقصد و بے منزل قوم بن کر رہ گئے ہیں۔ امریکی فلسفی پروفیسر نورتھروپ نے ایشیا کی ایسی قوموں کا مطالعہ کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ:

> "مغربی دنیا میں طرزِ زندگی (جس میں کلچر، نظامِ فکر اور زبان سب شامل ہیں) درآمد کرنے کا مسئلہ ایک خطرے کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ اس سے خطرہ پیدا ہو گیا ہے کہ ایشیا والے خود اپنے کلچر سے منقطع ہو گئے ہیں۔ نہ تو وہ وہ رہے ہیں جو اصل میں وہ تھے اور نہ مغرب کی سائنس، فلسفیانہ، مذہبی اور تہذیبی بنیادوں پر مضبوطی سے اپنے قدم جما سکے جو مغرب کے آلات، اشیاء اور خیالات کو پورے طور پر سمجھنا اور برتنے کے لیے ضروری تھا۔ وہ مشرق و مغرب کے درمیان معلق ہو کر رہ گئے ہیں اور ہر اعتبار سے سطحی ہو گئے ہیں۔ اتنے سطحی کہ وہ کچھ بھی نہیں رہے۔"

آج ہم بھی اس صورتِ حال سے دوچار ہیں۔ آپ ایک فرد کی حیثیت سے یہ سوال خود سے پوچھیے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ گزشتہ ساٹھ سال کے عرصے میں ہمارے ہاں کوئی بڑا سائنس دان، مفکر، مدبّر، منتظم، قانون دان، دانشور کیوں پیدا نہیں ہوا ہے، شرح خواندگی ہمارے ہاں سو فی صد کیوں نہ ہو سکی اور پھر خود اس بات کا جواب تلاش کیجیے تاکہ اس تلاش سے وہ سوچ پیدا ہو سکے جس سے قومیں بیدار ہو کر ہفت خواں سر کرتی ہیں اور خود کو دریافت کر کے اپنی سمت، اپنی منزل کا تعین کرتی ہیں۔ اس میں ایک بنیادی پہلو ذریعہ تعلیم اور قومی زبان کا ہے جو سارے مسائل کی جڑ ہے۔ شاید آپ میں سے کچھ یہ کہیں کہ وہ کیسے تو مجھے "تذکرۂ غوثیہ" والے سید غوث علی شاہ قلندر پانی پتی فرمانے لگے کہ وہ حکایت سنا دوں جو میں نے سنائی تھی۔

تو خواتین و حضرات! وہ مختصری حکایت یہ ہے کہ ایک شخص نے شیطان سے دوستی پیدا کی اور پوچھا کہ یار تم کو لوگ کیوں بدنام کرتے ہیں۔ اس نے کہا کہ میرا تو کچھ بھی قصور نہیں، صرف دشمنی سے لوگ برا بھلا کہتے ہیں۔ پھر شیطان کہنے لگا کہ آؤ تم کو ایک تماشا دکھاؤں مگر خاموش دیکھتے رہنا۔ کچھ دم نہ مارنا۔ اس شخص کو شیطان اپنے ساتھ لے گیا اور بتایا کہ آج اس شہر کی بربادی کا حکم ہے۔ اب دیکھو کیا ہوتا ہے۔ حلوائی کی دوکان پر چاشنی پک رہی تھی، شیطان نے انگلی بھر دیوار پر لگا دی وہاں فوراً مکھیوں کا جھمکٹ ہو گیا۔ چھپکلی نے جو دیکھا تو مکھیوں پر تاک لگائی۔ حلوائی کی بلی نے چھپکلی پر داؤ لگایا کہ جھپٹا مارے۔ ناگہاں ایک فوج کا سپاہی ادھر سے گزرا۔ اس کے ساتھ نہایت تیز شکاری کتا تھا۔ کتے نے جو بلی کو بیٹھا ہوا دیکھا، جھٹ اس کو جا دبوچا۔ بلی اچھل کر چاشنی کے اندر جا گری اور پھنس گئی۔ حلوائی کو غصہ آ گیا۔ کتے کے سر پر ایسا کفچہ مارا کہ وہ وہیں لوٹ گیا۔ پھر سپاہی کو کہاں تاب؟ بگڑ گیا اور حلوائی کو مارتے مارتے خون کر دیا۔ دوسرے حلوائیوں نے مل کر سپاہی پر یورش کی۔ وہ بھی وہیں ڈھیر ہو گیا۔ لشکر میں جو سپاہی کے قتل کی خبر پہنچی تو لگا کے توپ خانہ تمام شہر کو اڑا دیا۔ جب یہ ماجرا گزر چکا تو شیطان اس شخص کی طرف متوجہ ہوا کہ یار تم ہی انصاف کرو، اس میں میرا کیا قصور ہے۔ میں نے تو صرف ایک انگلی چاشنی دیوار پر لگا دی تھی۔ باقی بکھیڑا کس نے کیا لیکن کرنے والے کا نام کوئی نہیں لیتا۔ مجھ ہی کو نشانہ بنا رکھا ہے۔

خواتین و حضرات! آج مجھے بس آپ سے یہی کہنا تھا۔ اب اجازت دیجیے۔ آپ کا شکریہ، بہت بہت شکریہ۔

:\makhzan\pictur for 14\New Folder\1.jpg not found.

پروفیسر فتح محمد ملک

پنجاب کی مادری زبان اُردو ہے

عالمی پنجابی کانفرنس منعقدہ لاہور(۲۹ جنوری تا یکم فروری ۲۰۰۷) کے ایک اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے بھارتی پنجاب کے وزیر اعلیٰ کیپٹن امریندر سنگھ نے پاکستانی پنجاب کے وزیر اعلیٰ چوہدری پرویز الٰہی کو مشورہ دیا کہ وہ بھارتی پنجاب کی پیروی میں پاکستانی پنجاب میں بھی پنجابی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنائیں اور پرائمری سطح سے پنجابی زبان کی تعلیم لازمی قرار دیں۔سردار صاحب کے اِس مربّیانہ مشورے پر، مجھے اس موضوع پر تقریباً ایک صدی پرانی بحث یاد آ گئی ہے۔ہوا یوں تھا کہ پنجاب یونیورسٹی کے بنگالی وائس چانسلر سر چیٹر جی نے سو سال پہلے یکم فروری ہی کو اپنے کانووکیشن ایڈریس میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ پنجاب میں اردو کی بجائے پنجابی کو ذریعۂ تعلیم بنایا جائے۔اس پر پنجاب کے مسلمانوں میں مخالفت کا ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔اخبارات نے اپنے اداریوں اور خصوصی مضامین میں اس تجویز کی ''تغویت'' کو نمایاں کرتے ہوئے،اسے پنجاب کی تہذیبی اور سیاسی شخصیت کے خلاف ایک گھناؤنی سازش قرار دیا تھا۔سر چیٹر جی کی نیت پر شکوک وشبہات کا اظہار کیا گیا تھا۔اخبارات نے سوال اُٹھایا تھا کہ یونیورسٹی کے کانووکیشن ایڈریس میں اس طرح کی بے سروپا بحث کیوں چھیڑ دی گئی؟اس پر پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر سر لوئیس ڈین، سر چیٹر جی کی مدد کو آ پہنچے تھے۔

امرتسر میں ہندو سبھا کے مدرسے کا افتتاح کرتے وقت لیفٹیننٹ گورنر نے سر چیٹر جی کی تجویز کی پُرزور حمایت کی اور اسے تعلیم کے فروغ کے لیے ضروری قرار دیا۔چنانچہ وائس چانسلر کے ساتھ ساتھ لیفٹیننٹ گورنر صاحب بھی تنقید کی زد میں آ گئے۔لیفٹیننٹ گورنر سے پوچھا گیا کہ کیا وہ انگلستان کے سکولوں میں انگریزی کی بجائے یارک شائر کی مقامی بولی رائج کرنا پسند فرمائیں گے؟اس پر انہوں نے معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے وضاحت پیش کی کہ ہندو سبھا کے اجلاس کی پہلی دو قطاروں میں بیٹھے ہوئے چند مسلمان رئیسوں کو دیکھ کر انہیں اُردو کی بجائے پنجابی کے ذریعے سے تعلیم کی اشاعت کی تجویز یاد آ گئی تھی اور یوں وہ سر چیٹر جی کے دفاع میں بول اُٹھے تھے۔

یہاں میں قارئین کرام کی خدمت میں اس ہنگامہ خیز بحث کے صرف وہ بنیادی نکات پیش کرنا چاہتا ہوں جو میں نے ''پیسہ اخبار لاہور'' میں فقط ایک ماہ(۲۶ فروری ۱۹۰۹ء سے ۲۵ مارچ ۱۹۰۹ء تک) کے دوران شائع ہونے والے اداریوں اور

مضامین سے اخذ کیے ہیں۔ "پیسہ اخبار" کے ایڈیٹر منشی محبوب عالم اور دیگر مضمون نگاروں کا استدلال یہ تھا کہ پنجابی اور اردو بنیادی طور پر ایک ہی زبان ہے۔ پنجابی اردو کا پرانا روپ ہے اور اردو پنجابی کی ترقی یافتہ صورت ہے۔ پنجابی کے ترقی یافتہ روپ یعنی اردو کو چھوڑ کر اردو کی ابتدائی شکل یعنی پنجابی کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے پیچھے مسلمانوں کے خلاف سازش کارفرما ہے۔ سازش کی نوعیت کو بے نقاب کرتے وقت مضمون نگاروں نے اندیشہ ظاہر کیا کہ پہلے تو علمی زبان بنانے کے بہانے پنجابی میں سنسکرت الفاظ کی بھرمار کر دی جائے گی اور پھر اس کا قرآنی رسم الخط گورمکھی رسم الخط سے بدل دیا جائے گا۔ چنانچہ پنجابی اپنے عربی فارسی ذخیرۂ الفاظ سے محروم ہو کر اپنی اُس اسلامی شناخت سے محروم ہو کر رہ جائے گی، جو صوفیائے کرام نے اپنی عظیم پنجابی شاعری کی بدولت اسے عطا کر رکھی ہے۔ زبان کے ساتھ ساتھ پنجابی مسلمان بھی رفتہ رفتہ اپنے تہذیبی سرچشموں سے محروم ہو کر رہ جائیں گے۔ ۲۱ فروری ۱۹۰۹ء کے "پیسہ اخبار" میں "پنجابی بخلاف اردو" کے عنوان سے اپنے طویل اداریہ میں اخبار نے پنجابی ذریعۂ تعلیم کی نامقبولیت پر یوں روشنی ڈالی:

> "سررشتۂ تعلیم پنجاب گورمکھی شاخیں کھولے جانے کی منظوری دے چکا ہے لیکن اب تک بہت کم گورمکھی مدارس، اضلاع لاہور و امرتسر میں جاری ہو سکے ہیں۔ جہاں گورمکھی برانچیں کھولی گئیں، وہاں ان میں کامیابی نہیں ہوئی اور ان برانچوں نے ترقی کے متعلق آثار ظاہر نہیں کیے۔ یہ نہایت عجیب اور قابلِ غور امر ہے کہ گرونانک کے جنم استھان ننکانہ میں گورمکھی کی شاخ طلباء کے بہم نہ پہنچنے کی وجہ سے بند کرنی پڑی۔ اسی طرح سکھوں کے دیگر مقدس مقامات مثلاً امرتسر و ترن تارن کی گورمکھی برانچوں کی تعداد میں بھی تنزل ہوا ہے"۔

اس نامقبولیت کا سبب یہ بتایا گیا کہ درسی کتابوں کا پنجابی میں ترجمہ کرتے وقت "سنسکرت اور ہندی کے الفاظ بھر دیے گئے اور پنجابی کا یہ مصنوعی ترجمہ ان طالب علموں کے لیے بھی غریب ہو گیا کہ جن کی سہولت کے لیے ترجمہ کیا گیا تھا"۔ ۲ مارچ کے اداریہ بعنوان "اردو یا پنجابی" میں یہ موقف اختیار کیا گیا کہ حکومت نے "پنجاب میں ناگری کا ٹٹو چلتا نہ دیکھ کر پنجابی گورمکھی حروف کی آڑ میں اُردو کے خلاف مورچے قائم کر دیے ہیں۔ وہ پنجاب میں اردو کی ترقی کو ہرگز پسند نہیں کرتے۔ سر چیٹرجی کی تقریر سے مندرجہ ذیل نتائج اخذ ہوئے ہیں:

> "۱۔ پنجاب کے لوگوں کی مادری زبان صرف پنجابی ہے۔ ۲۔ اردو ایک بیرونی زبان ہے جو پنجاب میں برٹش گورنمنٹ کے سہارے مروج ہوئی ہے۔ ۳۔ کوئی شخص غیر زبان یعنی اردو میں علمی فضیلت حاصل نہیں کر سکتا۔ اُردو کی بجائے پنجابی کو فروغِ تعلیم کا ذریعہ بنانے کے حق میں دیے گئے یہ تمام دلائل غلط، کمزور اور بیہودہ ہیں"۔

اسی عنوان کے تحت ۱۷ مارچ کے مقالۂ افتتاحیہ میں یہ نظریہ پیش کر دیا گیا کہ پنجابیوں کی مادری زبان اردو ہے۔ چنانچہ

مادری زبان میں تعلیم کے تمام فوائد اُردو زبان میں تعلیم سے پورے ہو رہے ہیں۔ اُردو کے مقبولِ عام زبان ہونے کے ثبوت پیش کرتے کرتے اداریہ نویس نے اپنی تان یہاں آ توڑی ہے کہ:

> ''گورنمنٹ نے پنجاب میں اردو رائج نہیں کی بلکہ مروّجہ زبان اردو کو فارسی کی بجائے سہولت عامہ کے خیال سے دفاتر و عدالتوں میں داخل کیا۔ جبکہ اردو پیدا ہی پنجاب میں ہوئی ہے تو یہ یہاں کس طرح اجنبی ہو سکتی ہے۔ اردو پنجاب خاص کے مغربی گوشہ میں دریائے سندھ کے کنارے، عالمِ وجود میں آئی، مسلمان ماتحت قوموں کے باہم ملنے جلنے سے پیدا ہوئی جیسا کہ اردو کے لفظ سے ظاہر ہے۔ یہ لشکری زبان ہے۔ نہ صرف اس لحاظ سے کہ اردو نے صوبہ ہٰذا میں جنم لیا بلکہ اس وجہ سے بھی کہ جس طرح اب بکثرت پنجابی مسلمان عساکر انگلشیہ میں ملازم ہیں اُسی طرح اسلامی عہد میں بھی اُن کی بھاری تعداد مغلیہ لشکر میں موجود تھی۔ عام سادہ پنجابی اور سادہ اردو میں بہت کم فرق پایا جاتا ہے۔ اس مشابہت کے لحاظ سے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اگر پنجابی ملک کی ابتدائی بولی سمجھی جائے تو اُردو اس کی علمی و ترقی یافتہ صورت ہوگی۔ پنجابی اور اردو دونوں ایک ہی ہیں''۔

اپنے استدلال کو آگے بڑھاتے ہوئے اداریہ نویس نے جو مثالیں پیش کیں اُن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

> ''ایک پنجابی بچہ کسی قدر ہوش سنبھالتے ہی جو پہلے الفاظ منہ سے نکالتا ہے وہ خالص اردو ہوتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ تلفظ میں کہیں کہیں کسی قدر فرق ہوتا ہے۔ ایسا اختلاف جو بولنے اور تحریر میں ہو، دنیا کی تمام زبانوں میں پایا جاتا ہے۔ پنجابی بچہ جو پہلا لفظ ''اماں'' منہ سے نکالتا ہے وہ اردو ہے۔ جب اسے دودھ پینے کی خواہش ہوتی ہے تو یوں کہتا ہے ''اماں! دود''۔ اگر وہ فعل کے اضافے سے فقرہ پورا کرنا سیکھ گیا ہے تو کہے گا ''اماں! دود دے''۔ یہ تمام الفاظ جو بچہ ابتداء سے ماں کے دودھ کے ساتھ سیکھتا ہے اردو ہی ہیں۔ بچہ کسی قدر بڑا ہوا۔ تکلم نے بھی ترقی کی تو اب اس کے فقرات پر غور کیجیے۔ وہ علی الصبح اُٹھتا ہے تو اپنی پیاری ماں کو گہری نیند میں سویا ہوا پاتا ہے۔ ننھے ننھے ہاتھ اس کے گالوں پر رکھ کر کہتا ہے ''اماں! اُٹھو۔ دن چڑھیا (چڑھا) ہے''۔ جب روٹی کھانے لگتا ہے تو بھوک کے وقت ماں سے کہتا ہے ''اماں! روٹی کھانی اے (ہے)''۔ اسی طرح اردو پنجابی کی یکسانیت کی بیسیوں اور سینکڑوں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ پس سادہ پنجابی جس میں بچہ ہوش سنبھالتے ہی بولنے لگتا ہے، وہ اردو کے سوا اور کچھ نہیں''۔

اس بحث کے دوران ۲۵ مارچ کے اخبار میں ایس ایم ڈین ناظر نے اردو پنجابی کے عنوان سے اپنے خصوصی مضمون میں لیفٹیننٹ گورنر کو مخاطب کرتے ہوئے اس بات پر اصرار کیا کہ ''اُردو زبان دراصل منجھی ہوئی پنجابی زبان ہے۔ اس کے افعال عموماً پنجابی ہیں مگر تھوڑی سی نفیس تبدیلی کے ساتھ استعمال میں لائے گئے ہیں''۔ یہ بحث سالہا سال تک چلتی رہی اور اس کی گونج پورے

برصغیر میں سُنائی دیتی رہی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ سندھ اُردو کانفرنس (۱۹۲۰ء) کی صدارت کے لیے "پیسہ اخبار" کے ایڈیٹر منشی محبوب عالم کو مدعو کیا گیا جہاں انہوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں یہی استدلال پیش کیا۔

میں نے پیسہ اخبار میں شائع ہونے والے چند مضامین کا حوالہ صرف اس طویل بحث کے مرکزی خیال کی وضاحت کی خاطر دیا ہے ورنہ رسالہ "مخزن" سمیت اُس زمانے کے بیشتر اخبارات و رسائل میں یہ ہنگامہ خیز بحث مسلسل جاری رہی اور اس میں جن شخصیات نے حصہ لیا اُن میں علامہ اقبال کا نام نامی بھی شامل ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب علامہ اقبال "ترانۂ ملی" لکھ چکے تھے اور مغربی قوم پرستی کے تصور کی تردید میں "وطنیت" کی سی نظم شائع کر چکے تھے، جس میں پنجاب یا ہندوستان کی بجائے اسلام کو مسلمانوں کا دیس قرار دیا گیا تھا۔ "پنجاب کی مادری زبان اردو ہے" کے موضوع پر یہ بحث بالآخر ۱۹۲۸ء میں حافظ محمود شیرانی کی عہد آفریں کتاب "پنجاب میں اردو" کی اشاعت پر تکمیل کو پہنچی تھی۔

حافظ محمود شیرانی نے لسانی تحقیق کے جدید سائنسی اصولوں کی روشنی میں یہ حقیقت روشن تر کر دی کہ اردو زبان کا مولد پنجاب ہے۔ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم نے بتایا ہے کہ اس کتاب کی اشاعت کا انتظام اہلِ پنجاب نے چندہ جمع کر کے کیا تھا۔ اس کتاب کی اشاعت میں بیس برسوں پر محیط بحث کو ایسی تکمیلی شان عطا کی کہ اردو کو پنجابیوں کی مادری زبان ہونے کی جذباتی صداقت سائنسی حقیقت کا روپ دھار گئی۔ ایک صدی بعد بھارتی پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ نے سو سال پہلے رد کردہ تجویز کو پھر پیش کر دیا ہے۔ کاش پاکستانی پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ کو اللہ تعالیٰ اس حقیقت پر غور کرنے کی توفیق عطا فرمائے کہ اُردو کو دیس نکالا دینے کی تجویز کل اگر انگریز لیفٹیننٹ گورنر نے پیش کی تھی تو یہی تجویز آج ہمارے دشمن ملک بھارت کی طرف سے آئی ہے۔ ایک سو سال پہلے اگر پنجابی عوام نے اس تجویز کو حقارت کے ساتھ رد کر دیا تھا تو آج وہ اس حیرت میں گم ہیں کہ اس طرح کی تجاویز کے پسِ پردہ عوامل ہمارے حکمرانوں کی سمجھ میں کیوں نہیں آتے؟

متفقہ قرارداد

۱۔ مخزن قومی اردو کانفرنس متفقہ طور پر مطالبہ کرتی ہے کہ آئین پاکستان میں شامل دفعہ 251 پر فوری طور پر عمل درآمد کیا جائے۔ تا کہ اردو کو سرکاری اور دیگر مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے لیے انتظامات کیے جائیں۔

۲۔ وزیر اعظم کی کمیٹی برائے نفاذ اردو کی سفارشات پر حکومتی سطح پر فوری طور پر قدم اٹھانے کی ضرورت ہے۔

۳۔ کاغذ کی درآمد، پیداوار اور فروخت پر عائد کردہ ٹیکس کو ختم کیا جائے۔

۴۔ یہ نمائندہ اجلاس علمی وادبی کتابوں اور رسائل وجرائد کی بیرون ممالک بالخصوص بھارت ترسیل کے لیے مطبوعہ ڈاک کے اخراجات میں ناقابل برداشت اضافے پر تشویش کا اظہار کرتا ہے اور اسے علمی وادبی تناظر کے فروغ میں ایک بڑی رکاوٹ خیال کرتا ہے۔ لہٰذا یہ اجلاس مطالبہ کرتا ہے کہ اس بارے میں بین الاقوامی ممالک کے مابین مارچ ۲۰۰۱ء کے بعد ہونے والے ڈاک خرچہ کے اضافے کا فیصلہ واپس لیا جائے۔ نیز یہ کہ رسائل وجرائد پر ڈاک اخراجات کے ضمن میں خصوصی رعایت دی جائے۔

۵۔ مخزن قومی اردو کانفرنس ۲۰۰۷ء کا یہ اجلاس وفاقی وصوبائی حکومتوں سے مطالبہ کرتا ہے کہ ادیبوں اور دانشوروں کو اندرون وبیرون ملک سفر کے لیے کرایہ میں ۵۰% رعایت دی جائے اور متعلقہ محکموں اور اداروں کو اس سلسلہ میں ضروری عملی کارروائیاں کرنے کی ہدایت دی جائے۔

۶۔ سارک کی اہل قلم اور ادیبوں کی کانفرنس میں کتابوں کی ترسیل اور دیگر سفارشات کے بارے میں تجاویز پر عمل کیا جائے۔

۷۔ ان سفارشات پر آزاد کشمیر میں بھی عمل درآمد کرایا جائے۔

۸۔ مخزن قومی اردو کانفرنس میں شامل ادیبوں اور دانشوروں کا یہ اجلاس قائد اعظم لائبریری لاہور کے تمام کارکنوں کا خصوصی طور پر شکر گزار ہے کہ انھوں نے ہر ممکن طریقے سے محنت کر کے مندوبین کو سہولتیں فراہم کیں اور کانفرنس کو کامیاب بنایا۔

۹۔ مخزن قومی اردو کانفرنس ۲۰۰۷ء کا یہ اجلاس حکومت پنجاب، گورنمنٹ کالج لاہور یونیورسٹی، پنجاب انسٹی ٹیوٹ آف لینگویج آرٹ اینڈ کلچر، اراکین مجلس ادارت مجلہ مخزن اور جناب عنایت اللہ کی خدمات کا خصوصی اعتراف کرتا ہے۔

E:\makhzan\picture for 14\shahnaz\8.jpg not found.

مہتاب اکبر راشدی

سندھ میں اردو کا آغاز

اردو کی پیدائش کا مقام ڈھونڈنا ایک دقیق مسئلہ ہے، تاہم اس موضوع پر اب تک کافی تحقیق ہو چکی ہے۔ حافظ محمود شیرانی سے لے کر عین الحق فرید کوٹی، سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر شوکت سبزواری، نصیر الدین ہاشمی، مولانا محمد حسین آزاد، مولوی عبدالحق، پیر حسام الدین راشدی، ڈاکٹر سلیم اختر وغیرہ کی آراء میرے سامنے ہیں۔ ہر ایک محقق نے مختلف زاویوں سے اردو زبان پر تحقیق کی ہے اور یہ سلسلہ تا حال جاری و ساری ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پورے برصغیر میں سہل تر تنگ اور جامعیت کے لحاظ سے اردو کی کوئی مثال نہیں۔ اردو ایک ایسا حسین اور مسحور کن پودا ہے جسے ہر ایک نے اپنے آنگن میں دیکھنا پسند کیا ہے۔ مجھے تو ماہرین کے ہر ایک دعوے میں دلبری نظر آتی ہے۔

درج بالا محققین کے مطالعے کے بعد اردو زبان کی تاریخ اور ہیئت کے حوالے سے دو آراء واضح نظر آتی ہیں:۔

الف:۔ اردو کی جنم بھومی دکن (بحوالہ نصیر الدین ہاشمی 'دکن میں اردو') سندھ (سید سلیمان ندوی 'نقوش سلیمانی') پنجاب (حافظ محمود شیرانی 'پنجاب میں اردو') میں سے ایک ہے۔

ب:۔ اردو کی سرشت میں عربی، فارسی، ترکی اور ہندی زبان کی آمیزش شامل ہے۔

یہ ایک مسلمہ لسانی اصول ہے اور ماضی میں ایسی کئی مثالیں موجود ہیں کہ مختلف اقوام کے باہمی میل جول سے نئی زبانیں اور ثقافتیں وجود میں آئی ہیں۔ پاکستان میں 'ہندکو' اور ایران میں 'فارسی' کی مثالیں ملتی ہیں۔ ہندکو: پنجابی، سرائیکی اور پشتو کے میل سے بنی ہے، جبکہ فارسی زبان عربی، ترکی اور پہلوی زبانوں کی آمیزش سے وجود میں آئی ہے۔

اس حوالے سے اب میں اردو زبان کی ہیئت پر کچھ عرض کرنا چاہتی ہوں۔ اردو زبان کے رسم الخط پر غور کریں گے تو اس میں عربی کے تمام حروف تہجی فارسی کے مخصوص حروف پ، چ، گ، و، ژ اور ہندی کے بنیادی حروف ٹ، ڈ، ڑ کے علاوہ مخلوط حروف بھ، تھ، ٹھ، پڑھ، چھ، کھ، جھ، دھ، ڈھ، گھ شامل ہیں۔ سندھی زبان میں ماسوا فارسی 'ژ' کے باقی تمام حروف شامل ہیں۔ البتہ ان کے اپنے سات حروف مخصوص ہیں۔ لسانی کنبے کے لحاظ سے دونوں زبانیں ایک خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ یعنی شورسینی پراکرت اور وراچڈ (ملاحظہ کریں "سندھی بولی جی تاریخ" مصنف بھیرومل مہر چند آڈوانی ص، ۸۰) اور ڈاکٹر سلیم اختر نے اردو زبان کے مجھے

ہوئے محقق حافظ محمود شیرانی کی کتاب سے یہی بات اخذ کی ہے ("اردو زبان کی مختصر ترین تاریخ"، ص، ۱۹) اور یہ امر بھی مسلمہ ہے کہ سندھی اور اردو زبانوں کی صوتی تا صرفی اور نحوی تراکیب یکساں ہیں، ماسوا چند اصطلاحات کے۔ عربی، فارسی اور ہندی / سنسکرت کی لغوی میراث البتہ دونوں زبانوں کی مشترکہ ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر متذکرہ کتاب "اردو زبان کی مختصر تاریخ" کے صفحہ ۱۱ پر لکھتے ہیں:

"اس ضمن میں ڈاکٹر سید محمود نے اپنی تحقیقات سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ 'عربی زبان میں بہت سے ایسے الفاظ ہیں جو ہندوستان سے میل جول کا پتہ دیتے ہیں۔ سب سے زیادہ دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ خود قرآن مجید میں سنسکرت کا لفظ موجود ہے، عربی میں لفظ ہندی زبان کا مفرد قرار دیا گیا ہے۔ ایک سوا ونٹوں کے جھنڈ کو ہندیا ہندہ کہتے ہیں۔ ہند، ہندی یا ہندوانی اس تلوار کو کہتے ہیں جو بناوٹ میں مضبوط اور ہندوستان میں بنائی گئی ہو۔ قرآن مجید میں ایسے کئی کثیر الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جو عربی میں داخل ہو گئے تھے۔ بخاری، سیوتی وغیرہ جیسے محدثین اور ثعالبی جیسے ماہرین لغات نے ان کو یک جا کیا ہے۔ علماء کی ان روایات کے مطابق جس طرح اور زبانوں کے الفاظ قرآن میں ہیں، اسی طرح ہندی یا سنسکرت کے الفاظ 'بلعی'، اور 'سندس' کا بھی استعمال موجود ہے۔"

لفظ 'سندس' قابل توجہ ہے، ہمیں معلوم ہے کہ سنسکرت اور ہندی کے بعض الفاظ جن کے آخر میں 'س' آتا ہے، جیسے کہ سانس، گھاس، بیس، پچاس، ماس، پھانسی وغیرہ سندھی زبان میں ان کے آخر میں 'س' بدل کر 'ہ' بن جاتا ہے جیسے ساہ، گاہ، ویھ، پنجاہ، ماہ، قاھی وغیرہ۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ ہندی، اردو، سندھی، پنجابی وغیرہ کی طرح عربی مخلوط زبان Aspirated Language نہیں ہے، عربی میں کوئی حرف مخلوط نہیں ہوتا جیسا کہ ہماری زبانوں میں ہے۔ مثلاً بھ، تھ، ٹھ وغیرہ۔ اس لحاظ سے عربی لغات کے قواعد کے تحت 'سندھ' کو 'سندس' لکھا گیا۔ جس طرح آج کل پاکستان کو باکستان اور کراچی کو کراتشی لکھتے ہیں۔ 'سندس' لفظ کی مزید تشریح ہندوستان کے جید عالم اور سنسکرت، عبرانی، عربی، فارسی، انگریزی زبانوں کے ماہر علامہ ابوجلال ندوی نے جامعہ کراچی کے شعبہ تصنیف، تالیف و ترجمہ کے جریدہ نمبر ۴ بعنوان "دنیا کے زبانوں سے سندھ کا تعلق" کے صفحہ ۱۸ پر اس طرح کی ہے "یہ تمام بحث اس یقین کے لیے کافی ہے کہ سندھی رسم الخط نے عرب تک سفر کیا اور عرب کے رسم الخط قبل قرآن کا نام "سندس" تھا، اس نام کے نقوش اور خود یہ نام سندھ سے اپنا رابطہ ظاہر کرتے ہیں۔"

دارالعلوم ندوہ کے فارغ تحصیل عالم ابوجلال کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ سید سلیمان ندوی نے دی۔ ابوجلال صرف موہن جو دڑو کی مہروں اور تحریروں کے مشاہدے کے لیے دہلی کو چھوڑ کر کراچی آئے اور اپنی تحقیقات کو کافی حد تک مکمل کیا۔ اس ضمن میں لکھتے ہیں کہ:

"سندھی رسم الخط کو سمجھنے والوں نے دانستہ عرب، عربی زبان اور اس کی ہم نسل زبانوں کی روشنی میں سندھی مہروں کے تقابلی مطالعے کو نظر انداز کیا ہے تا کہ سندھ اور عرب کے تعلقات کی بابت کوئی انکشاف نہ ہو سکے،

اور تاریخ کے اس منظر کو تحقیق کی روشنی نصیب نہ ہو سکے۔"

علامہ ندوی نے اپنی تحقیق کا اختصار جامعہ کراچی کے حوالے کیا، جو جریدہ نمبر ۱۱، ۱۲ اور ۱۳ پر محیط ہے۔ ان جرائد کو سید خالد جامعی اور عمر حمید ہاشمی نے مرتب کیا ہے۔ جو جرائد ۲۰۰۴ء میں شائع ہوئے ہیں۔ اس سے قبل ندوی صاحب کی یہ تحریریں زیادہ تر 'ماہ نو' کراچی سن پچاس کی دہائی میں شائع ہوئی ہیں۔

مولانا صاحب کا موقف ہے کہ عبرانی زبان کا سر چشمہ سندھ ہے۔ یہاں سے لوگ عراق، مصر، شام اور اسرائیل گئے۔ تجارت کی ترقی کے ساتھ اپنی زبان کو ترویج دی۔ یہ تجارتی اور تہذیبی تسلسل ہزاروں سالوں پر محیط ہے۔ انہوں نے اہل عرب اور سندھ کے تجارتی، تہذیبی اور تمدنی تعلقات پر اچھی خاصی بحث کی ہے جو 'ماہ نو' کے جرائد میں محفوظ ہے۔

ماہرین لسانیات اس بات پر بھی متفق ہیں کہ عربی زبان کی بنیاد عبرانی (Hebrew) ہے Philological Studies بتاتی ہیں کہ عربی زبان کے حروف تہجی میں ابجد، ہوز، حطی، کلمن، سعفص، قرشت، عبرانی زبان کے ہیں۔ جبکہ ثخذ اور ضظغ حروف عربی زبان کے اپنے ہیں۔ حروف کے جو اعداد مقرر کیے گئے ہیں یہ روایت بھی سندھ سے لی گئی ہے۔ بقول علامہ ابو جلال ندوی "ماہرین کے مطابق سندھ میں مروج طرز تحریر حسابی تھا" بعض مؤرخین کی رائے ہے کہ اہل عرب میں باضابطہ علم ریاضی نہ تھا اور یہ علم انھوں نے سندھ سے حاصل کیا اور اس کا نام ہی "علم سندسہ" رکھا، جو بعد میں 'علم ہندسہ' مروج ہوا۔ یورپی محققین کی رائے ہے کہ برصغیر میں ایک ایسی قوم ہے جو آج بھی انگلیوں پر گنتی ہے، جو فطرت سے قریب تر ین طریقہ ہے۔ سندھی زبان میں اعداد کو 'انگ' کہتے ہیں تو عضو کو بھی 'انگ' کہتے ہیں۔ چونکہ انسانی اعضاء میں ۲۰ انگلیاں ہیں تو اہل سندھ میں اعداد کی آخری اکائی ۲۰ تھی۔ اور ان کے ثبوت موہن جو دڑو سے بھی ملے۔ حیرت کی بات ہے کہ انگریزی اور کئی دوسری زبانوں میں بیس تک گنتی اکائی سے شروع ہوتی ہے اور بیس کے بعد دہائی سے۔ جس کے حوالے سے سندھی زبان میں آج بھی کئی قدیم کہاوتیں موجود ہیں۔

عربان زبان جب وسعت پذیر ہوئی اور عجم تک پھیلی تو اہل فارس نے عربی کے رائج ۲۸ حروف اخذ کیے اور اس میں مزید چار حروف پ، چ، گ، ژ کو شامل کیا جن کو پ فارسی، چ فارسی، گ فارسی اور ژ فارسی کہتے ہیں۔

عرب جب یہاں سندھ میں آئے تو بہت سے قدیم حروف پہلے سے یہاں رائج تھے۔ بعض حروف صوتی افادیت کھو چکے تھے جن میں ص۔ غ۔ ذ۔ ث۔ ق وغیرہ شامل تھے۔ بہر حال سندھی زبان میں آج عربی زبان کے تمام حروف تہجی، فارسی کے متذکرہ حروف ماسوائے ژ کے اور اپنے مخصوص سات حروف پ ڈ ڄ ڃ ڳ گ شامل ہیں۔ باقی حروف مخلوط ہیں جو اردو، ہندی اور برصغیر کی دیگر زبانوں میں شامل ہیں۔ سندھی زبان میں ان حروف کو بے قاعدہ شکل دی گئی ہے جس کی وجہ سے سندھی کی زبان فہمی میں دیگر اقوام کو مشکل پیش آتی ہے۔ (مثلاً پ۔ ٿ۔ ڃ۔ ٺ ڏ۔ ڊ۔ گھ۔ جھ)

اردو زبان چونکہ عربی، فارسی اور ہندی زبانوں کے حروف سے بنی ہے ان کی اپنی کوئی تخصیص نہ تھی لہٰذا اس کی حروف تہجی میں کوئی خاص حرف شامل نہیں۔

یہ امر بھی مسلمہ ہے کہ اردو زبان کی تشکیل خواہ ترقی و ترویج میں مسلمانوں ہی کا کلیدی کردار رہا ہے۔ اردو زبان ہر طرح سے مسلمانوں کی مرہون منت ہے۔ یہ زبان نہ صرف برصغیر بلکہ براعظم میں مسلم ثقافت، فکر اور شناخت کی علامت بنی، بلکہ بقول حافظ محمود شیرانی ''حقیقت یہ ہے کہ اردو کی داغ بیل اسی دن سے پڑنی شروع ہو گئی ہے جس دن مسلمانوں نے ہندوستان میں آ کر توطن اختیار کر لیا۔''

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ اردو کی تولید کے تین منابع تسلیم کیے گئے ہیں۔ سندھ، دکن، پنجاب اور یہ بات بھی لازم و ملزوم کے طور پر تسلیم کی گئی ہے کہ برصغیر میں مسلمانوں کی آمد سے اردو وجود میں آئی۔ اس کلیہ کے تحت چونکہ مسلمانوں کی آمد سب سے پہلے سندھ میں ہوئی اور ان کی کثیر تعداد سندھ میں سکونت پذیر ہوئی لہٰذا اردو کی ابتدا اور نشو و نما بھی سندھ میں ہی ہوئی۔ دوم اگر اردو کی ہیئت کو فارسی سے مشروط کیا جاتا ہے تو بھی اس ضمن میں سندھ کو سبقت حاصل ہے، کیونکہ اہل فارس کی سندھ میں ساسانی خاندان کے حاکم نوشیروان بن قباد کی حکومت ۵۳۱ سے ۵۷۹ تک رہی ہے[۱]۔ یہی بنیاد تھی جس کی بنا پر سید سلیمان ندوی نے عربی، فارسی اور سندھی زبان کے امتزاج اور لسانی و تہذیبی روابط کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا:

''مسلمان سب سے پہلے سندھ میں پہنچتے ہیں، اس لیے قرین قیاس یہی ہے کہ جس کو ہم آج اردو کہتے ہیں، اس کا ہیولیٰ اسی وادی سندھ میں تیار ہوا ہوگا۔''

آپ اپنے ایک اور مقالہ بعنوان 'اردو کیوں کر پیدا ہوئی؟' میں بھی انہی شواہد کو دہراتے ہیں:

''ہر صوبے کی مقامی بولیوں میں مسلمانوں کی زبان کے الفاظ کا میل ہو کر ایک نئی بولی پیدا ہونے لگی۔ مسلمان اور ہندوؤں کا یہ میل جول سب سے پہلے ملتان سے لے کر ٹھٹھہ تک سندھ میں اور پھر ہند میں ہوا۔''

سندھ کے جید محقق اور مؤرخ پیر حسام الدین راشدی بھی اس نظریے کے حامی تھے۔ انہوں نے ایک طویل مقالہ بعنوان ''اردو زبان کا مولد۔ سندھ'' رقم کیا اور مختلف ادوار کا تذکرہ کرتے ہوئے ثابت کیا کہ اردو کی داغ بیل سندھ میں ہی ڈالی گئی۔ پیر صاحب لکھتے ہیں:

''چوتھی صدی ہجری میں وہ نئی فارسی جو عربی کی شیر مادر پر پل کر بڑی ہوئی، وہ ایران، ترکستان، خراسان اور غزنہ میں بلوغت پا رہی تھی، اس عربی آموز فارسی نے آگے چل کر اردو کی دایہ کے طور پر خدمت کی، جب عربوں کی حکومت میں زوال آیا تب سندھ پر پہلے غزنوی حکمرانوں اور اس کے بعد غوری حکمرانوں نے حکومت کی۔''

تاریخی حوالے سے پیر صاحب اردو کے اولین شاعر شیخ فرید الدین شکر گنج (ولادت ۵۶۹ھ) کو گنواتے ہیں جن کا تعلق ملتان اور اُچ شریف سے تھا، یہ دونوں شہر اس وقت سندھ میں شامل تھے۔ پیر صاحب نے تذکرہ 'سیر الاولیاء' سے چند کلمات بھی نقل کیے ہیں جن میں قابل ذکر یہ مکالمہ ہے جب خواجہ شکر گنج نے صاحبزادہ شیخ برہان الدین کو کم سنی میں خلافت عطا کی تو 'مادر مومنان' نے عرض کیا: ''حضرت خواجہ بالا ہے'' تو حضرت شکر گنج نے فرمایا: ''مادر مومنان پونم کا چاند بھی بالا ہوتا ہے۔''

اس بحث کو سمیٹتے ہوئے پیر حسام الدین راشدی مرحوم لکھتے ہیں:

"ہم اردو کی ابتدائی نشوونما کا زمانہ ساتویں اور آٹھویں ہجری کو قرار دیتے ہیں جب ہندوستان پر ترک حکمرانوں کی حکومت تھی اور فارسی زبان کو سرکار، دربار، دینی درس گاہوں اور خانقاہوں میں پورا دخل تھا۔ شمالی ہند کی زبانوں میں فارسی کی آمیزش سے اردو زبان کا وجود میں آنا ایک ایسی حقیقت ہے جس سے محدود مطالعہ کے حامل لوگ بھی انکار نہیں کر سکتے۔ اس زمانے میں سندھ کی بیشتر شہر اسلامی علوم وفنون اور صنعت و تجارت کے مرکز تھے۔"

پیر صاحب اردو شاعری کی ابتدا کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"اب ہم ان ادوار پر اجمالی نظر ڈالتے ہیں جب اردو، شعروشاعری کی زبان بن رہی تھی، حضرت امیر خسرو وغیرہ کے کچھ متفرق اشعار ملے ہیں جو عربی بحروزن پر کہے گئے ہیں۔ خواجہ فریدالدین شکرگنج کے بعض اشعار ملے ہیں۔ میرے نزدیک قدیم اردو میں شاعری کا باقاعدہ آغاز قطب شاہی دربار میں ہوا۔ قطب شاہ کا دور ۹۸۸ تا ۱۰۲۰ھ ہے۔ آپ کی طرز تحریر دکنی ہے۔ اس زمانے میں سندھ میں مقبول عام شاعر میر محمد فاضل بکھری موجود تھے جو میر معصوم کے چھوٹے بھائی تھے۔ جن کے سندھ کے علاوہ دہلی کے حکمرانوں سے قریبی مراسم تھے۔"

بعد میں پیر صاحب نے اردو کے حوالے سے تین ادوار کی تقسیم اس طرح کی ہے۔

دور اول ۱۷۰۰ سے ۱۷۴۷

دور دوئم ۱۷۴۷ سے ۱۸۴۳

دور سوئم ۱۸۴۳ سے ۱۹۰۰۔

ان ادوار کے مطابق پیر صاحب نے شاعر حضرات کی صف بندی کی ہے۔ پیر صاحب نے اس عہد کے تاریخی ماخذات کا بھی ذکر کیا ہے۔ جن میں مقالات الشعراء، تاریخ تحفۃ الکرام، مرزا غازی بیگ ترخان اور اس کی بزم ادب، تاریخ امیر خانی وغیرہ شامل ہیں۔ سندھ کے معروف محقق ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ نے ۱۹۶۷ء میں اردو کے حوالے سے ایک کتاب "سندھ میں اردو شاعری" مرتب کی تھی۔ اس میں عبدالحکیم عطا ٹھٹوی کو سندھ کا پہلا شاعر شمار کیا ہے۔ جو بقول میر علی شیر قانع، ٹھٹہ کے گورنر مظفر خان (۱۰۶۳ تا ۱۰۶۹) نے اپنی سرپرستی میں ان کے شاعرانہ ذوق کی آبیاری کی۔ عطا کی شاعری کا آغاز سنہ ۱۰۶۰ھ سے ہوتا ہے۔ ارغون اور مغل حکمرانوں کی آمد سے سندھ میں شعروادب کا سلسلہ خصوصاً بڑے شہروں میں زوروں پر تھا۔

واضح رہے کہ امیر خسرو کا موسیقی کے لحاظ سے ہی نہیں اردو کی ترقی وترویج میں بھی اہم کردار رہا ہے۔ آپ نے اپنے دور کی مشہور زبانوں کا تذکرہ کچھ اس طرح کیا ہے:

سندی و لاہوری و کشمیر و کبر
دہور سمندری تلنگی و گجر
معبری و گوری و بنگال و اودھ
دہلی و پیرا منش اندر ہمہ حد

این ہمہ ہندوست ز ایام کہن
عامہ بہ چو کارست بہ ہر گونہ سخن

امیر خسرو نے زبانوں کی یہ ترتیب کس بنا پر رکھی ہے، یہ بات کوئی Philologist ہی بتا سکتا ہے۔ آپ نے دہلی کا جو تذکرہ کیا ہے اس کا اشارہ دہلی دربار سے ہے، جہاں اردو سرکاری سرپرستی میں پنپ رہی تھی۔

اردو کی ابتدا کے بارے میں سندھ کے مفکر علامہ آئی آئی قاضی نے ۱۵ دسمبر ۱۹۴۸ء کو کراچی میں منعقد یوم اردو کانفرنس میں خطبہ صدارت میں لفظ اردو کے آغاز اور بدلتی صورتوں کے بارے میں خاصی دلچسپ اور معلومات افزا گفتگو کی۔ انہوں نے فرمایا کہ لفظ 'اردو' آریائی زبان کے قدیم ترین لفظوں میں سے ہے اور آج تک زندہ چلا آ رہا ہے۔ یہ آریائی تمدن کی ابتدا اور اس کی خاصیت کا مظہر ہے۔ یہ لفظ اصلاً ترکی نہیں بلکہ مقامی ہے۔ سندھی زبان میں ڈھیر یا اشیاء کے ذخیروں اور انسانی اجتماع کو 'اُڑو' کہتے ہیں۔ سندھی زبان میں یہ لفظ کئی دیگر معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

آپ غور کریں جس سال اہل سندھ پاکستان حاصل کرنے کے لیے سندھ اسمبلی سے قرارداد منظور کرتے ہیں۔ اسی سال سندھ میں جشن ولادت اردو منایا جاتا ہے۔ ایسی تقریبات خیرپور اور لاڑکانہ میں بھی منعقد ہوتی رہیں تو ان تقریبات کا پس منظر کیا تھا، وہ کون سے محرکات تھے جن کی بنا پر اہل سندھ اردو زبان کی ترقی و ترویج میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔ کیا یہ سمبندھ دین کی وجہ سے تھا، یہ فطری جذبہ تھا یا پھر عصر حاضر کے محقق ڈاکٹر جمیل جالبی کے بقول 'دائرہ' کی تکمیل تھی۔ ڈاکٹر صاحب "تاریخ ادب اردو" صفحہ ۱۹۰ پر لکھتے ہیں کہ:

> "جیسے سندھ کے عمرکوٹ میں پیدا ہونے والا بچہ آگے چل کر شہنشاہ ہند، اکبر کے نام سے مشہور ہوا، اسی طرح سندھ و ملتان میں پروان چڑھنے والی یہ زبان (اردو) پنجاب اور ترک افغانوں کی توانائی کو جذب کر کے صدیوں بعد دہلی پہنچی اور وہاں کی بولیوں سے نیا رنگ و نور لے کر جلد ہی مسلمانوں کی فتوحات کے ساتھ سارے برصغیر کی مشترکہ زبان بن گئی اور اب بارہ سو سال بعد پھر اپنے وطن مالوف واپس آ کر دائرے کو مکمل کرتی ہے جو محمد بن قاسم کی فتح سندھ (۹۳ھ / ۷۱۲ء) کے فوراً بعد سے بننا شروع ہوا تھا۔"

میں ڈاکٹر جمیل جالبی کے خیالات سے متفق ہوں اور سمجھتی ہوں کہ سندھ اردو کا خمیر تھا اور اب ضمیر ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو اب دنیا کے اہم ترین ۳۶ ممالک میں بولی جاتی ہے، جس میں یورپی ممالک اور عرب ریاستوں کے علاوہ ایشیا کے سب ممالک شامل ہیں۔ لیکن صوتی، صرفی اور نحوی تراکیب کے لیے یا یوں کہیے کہ مستند اردو کے لیے دنیا آج بھی سندھ کی رہین منت ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ملاحظہ کریں: ابن خلدون جلد ۲ بلوک فارس، ص ۴۴ ترجمہ دہلی بحوالہ: جنت السندھ، سندھی ادبی بورڈ، ۵۷

:\makhzan\pictu
for 14\New
Folder\7.jpg not
found.

عبدالحکیم بلوچ

اردو بلوچستان میں

مقالہ کے عنوان کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ اردو بلوچستان میں شاید کوئی نووارد اجنبی ہے یا یہ کہ اس لفظ سے بلوچ نا آشنا ہیں۔ مگر حقیقت کچھ اور ہے کہ اردو بلوچی لغت میں ایک مجرد چار حرفی لفظ نہیں ہے بلکہ بلوچی زبان، ثقافت، گھریلو زندگی اور رہن سہن کا ایک جیتا جاگتا، تاریخی، معاشرتی و تہذیبی ورثہ ہے، جو سلیقہ شعاری اور گھڑ پن کی علامت ہے۔ جسے ہر ''سنگین و گراں مہذب'' خاتون خانہ صدیوں سے نہیں بلکہ ہزاریوں سے اپنی گھریلو زندگی کا اہم تہذیبی شعار مدنی جانتی رہی ہے اور سدھار و سجاوٹ کا اس کو بنیادی ستون جانتی رہی ہے۔ اس لیے اردو کو ترتیب دینے کے لیے ''سارگ'' کا مصدر چن لینا ہی ذوق سلیم اور شائستگی آداب کے طور پر اب تک مستعمل ہے گو کہ اردو اور اُرش، عسکر اور حملہ کے لیے بلوچی زبان میں اب تک بولے جاتے ہیں مگر ''اردو'' جیسا کہ خیال کیا جاتا ہے کہ لشکر کو کہتے ہیں شاید منگولوں کے لشکر و عسکر کے لیے ایسا کہا گیا ہو، مگر بلوچوں کے معاشرتی و ثقافتی فرہنگ میں اردو تہذیب و ترتیب کے ضمن میں مستعمل ہوا ہے اور اب تک ہے۔ گھر بار کی سجاوٹ میں، اوڑھنا، بچھونا یعنی بوف، بالشت و لحاف کمبل کو گھر کے اندر کے چبوترے پر ترتیب سے سجانے، رنگوں کی قوس قزحی ترتیب (درین) میں تہہ بہ تہہ رکھ موتیوں اور دوچ (کشیدہ) سے مزین پٹیوں سے گجوں جیسا مزین کرنے کو اردو سجانا کہتے ہیں۔

میرے خیال میں اردو زبان بھی ایسے ہی ثقافتی اور تہذیبی رنگوں میں ڈھل کر نکھرتے نکھرتے عرب، عجم اور ہند کی تہذیبی سنگم میں ظہور پذیر ہوئی اس لیے بلوچ شاعر گل محمد ناطق نے لکھنؤ کے نواب امین الدولہ کی شان میں جو قصیدہ لکھا تو اس کو لکھنؤ میں بھی شیراز و اصفہان کی غیرت بھلی لگی۔

گر چنیں تربیت اہل سخن خواہی کرد
لکھنؤ غیرت شیراز و صفاہاں گردد

اس لیے یہ استدلال کہ احمد شاہ ابدالی کی افواج کے دوش بدوش ۱۷۶۰ء کی لڑائیوں میں خان قلات، میر نصیر خان نوری کی لشکریوں کی شرکت اور مرہٹوں اور سکھوں کی سرکوبی میں پنجاب اور پانی پت کی لڑائیوں کے دوران، خیمہ زن ہونے کے دوران بلوچ اور افغان سپاہیوں نے اردو کے الفاظ استعمال کیے، تاریخی و سماجی طور پر درست نہیں ہے کہ بلوچوں اور افغانوں کے

ہندوستان سے تعلقات اور بین الاقوامی روابط بہت قدیم ہیں۔ سولھویں صدی میں جب رندوں نے معزول بادشاہ ہمایوں کو بحفاظت ایران پہنچایا تھا تو ایرانی سپاہ کے دوش بدوش وہ کابل اور دلّی کی لڑائیوں میں شریک رہے تھے اور میر چاکر خان رند سے منسوب ایک نظم بھی دلّی کی فتح کے بارے میں آج تک گائی جاتی ہے۔ ٹمپل نے تولی جنڈز آف پنجاب میں میر چاکر خان رند کی مہمات کے بارے میں لکھا ہے اور لونگ ورتھ ڈیمز نے پاپولر پوئٹری آف بلوچیز میں اس نظم کو شامل کیا اور ستیہ گڑھ (فتح پور) میں میر چاکر خان رند کا تاریخی قلعہ اور مزار اب تک اس کے کارناموں کی شہادت دیتے ہیں جو چار سو سال پہلے کے ہیں اس لیے ''اردو الفاظ کا استعمال'' مہمل ہے۔ اردو زبان کا بولنا یا اردو زبان کو استعمال کرنا جدا حیثیتیں ہیں۔ علمی اور ادبی سطح پر اردو کا استعمال شخصی طور پر بہت پہلے سے ہے اور سرکاری طور پر اتنا پرانا نہیں۔ اس پر ہم آگے مفصل بحث کریں گے۔ پہلے مرزا گل محمد ناطق اور بعد میں ملا محمد حسن کی اردو، بلوچی اور فارسی شاعری پر بات ہوگی۔

مرزا گل محمد ناطق کا تعلق مکران کے مردم خیز خطہ پنجگور سے تھا جو اصفہان اور شیراز سے تحصیل علوم عربیہ وفارسیہ کے بعد پنجگور پہنچا۔ دیکھا کہ اس کے علاقے کی قدیمی تہذیب وتزئین بطوائف الملوکی کے سبب اس قدر بدحال ہو چکی تھی۔ اس جیسے جید عالم کے لیے اس ماحول میں گزر بسر کرنا محال ہو چکا تھا۔ زوال کے دیو سبک پا نے صفوی مملکت کی آنکھوں کو عرصہ ہوا بجھا دیا تھا اور اس عفریت نے نہ مکران کو بخشا تھا اور نہ خضدار و قلات کو نہ بی اور گنداواہ میں وہ شادابی رہی تھی جو رندوں کے دور میں یا کہ نصیر خان اول کے دور میں ہر جا و ہر کجا سایہ فگن تھی۔ اس کا اظہار ناطق نے اپنے درج ذیل اشعار میں یوں کیا تھا:

نہ کتاب در بغل شان، نہ قلم در کف شان
در بغل ہیزم و در دست تبر می بینم
ہمہ آفاق بنوشند، گلاب و قند ست
مکریاں را ہمہ از خون جگر می بینم

یہ انیسویں صدی کے دوسرے اور تیسرے عشرہ کا زمانہ تھا۔ یہ علاقے یاغستان بن چکے تھے۔ یعنی قانون وحکمرانی نام کو بھی مفقود ہو چکی تھی۔ مکران کی سلطنتیں کب کی تباہ ہو چکی تھیں مگر اس قدر بدحالی کبھی نہیں رہی تھی۔ ایک دور وہ بھی تھا کہ مکران کی سلاطین کے ہاں سراج الدین خراسانی اور بدیع الدین تر کوہستانی ان کے دربار سے منسلک تھے اور ان کی شان میں قصیدے کہا کرتے تھے۔ علم وفضل کو جب تک دربار و سرکار کی سرپرستی حاصل نہ ہو، عالم اور فاضل کا پنپنا در کنار، اس کا گزر اوقات بڑی مشکل سے ہوتا ہے۔ جس نے ایک دفعہ قلم و قرطاس سے رشتہ جوڑا ہو اس کو بغل میں لکڑیاں تھامنا اور ہاتھ میں کلہاڑی اٹھانا ناممکن لگتا ہے اس صورت حال کا ناطق کے مندرجہ بالا اشعار سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس لیے وہ مکران سے سندھ، پھر پنجاب اور دہلی سے ہوتا ہوا لکھنؤ پہنچ گیا۔ دلّی میں ناطق کی دوستی غالب سے ہو گئی تو غالب نے اپنا فارسی دیوان ناطق کو نظر ثانی کی غرض سے دیا تھا۔ ناطق کے فارسی کلام کا ایک مجموعہ اس کے ایک شاگرد معظم سنگھ نے جوہر معظم کے نام سے محفوظ کر لیا تھا۔ جس کو بلوچی اکیڈمی

نے کچھ سال پہلے دوبارہ شائع کیا جس کا ایک تفصیلی جائزہ بطور دیباچہ ہمارے محترم استاد جناب ڈاکٹر انعام الحق کوثر نے لکھا ہے، لیکن آپ نے ان کے اردو کلام کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ البتہ پروفیسر انور رومان صاحب جو کہ گورنمنٹ کالج کوئٹہ میں ہمارے تاریخ کے استاد رہے ہیں انہوں نے اپنے ایک مضمون میں ضرور لکھا ہے۔ گل محمد ناطق اردو میں بھی شاعری کرتے تھے اور ظاہر ہے آپ نے اپنی مادری زبان بلوچی میں بھی شاعری کی ہے مگر ان دنوں چونکہ فارسی، عالموں کے لیے پڑھنے، پڑھانے اور لکھنے لکھانے کی واحد زبان تھی، اس لیے بلوچی شاعری کا بھی کوئی دیوان دستیاب نہیں ہے۔

اسی طرح آپ کا کوئی اردو دیوان اب تک دستیاب نہ ہو سکا ہے جو شاعر سندھ، لاہور، دہلی اور لکھنؤ میں تیس سال تک بود و باش رکھتا ہو وہ یقیناً غالب کی طرح ذوالّلسانی شاعر بھی ہو سکتا ہے اگر ایسا ہے تو گل محمد ناطق، اردو شاعری میں اردو کے دور ثانی کے پہلے بلوچ شاعر تھے اور دوسرا بلوچ شاعر جس نے فارسی اور اردو میں شاعری کی ہے وہ ملا محمد حسن ہیں، جو گل محمد ناطق کے ہم عصر تھے مگر ملا محمد حسن تین پشتوں سے دربار خان قلات سے منسلک رہے تھے اور مائین ریاست قلات میں سے تھے۔ اس کو خوانین قلات کی سرپرستی حاصل رہی، اس لیے ان کے باقاعدہ قلمی دیوان دستیاب ہوئے ہیں۔ ہمارے استاد محترم پروفیسر ڈاکٹر انعام الحق کوثر نے اپنی کتاب ''بلوچستان میں اردو'' میں اس کا تفصیل سے ذکر کیا ہے ان کے مطابق ان میں سے چار تو فارسی زبان میں ہیں اور پانچویں قلمی نسخہ کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ فارسی میں ہے اور ۴۱ اوراق پر مبنی ہے۔ اردو کے اوراق ۴۱ ہیں۔ اس نسخے کی لوح سنہری ہے، ہر ورق پر دوہرا سنہری حاشیہ موجود ہے۔ بعض عنوانات اور مقطعے سرخ روشنائی سے لکھے ہوئے ہیں۔ کاتب گل محمد اور تاریخ پانزدہم شہر رجب المرجب ۱۲۶۷ھ (مطابق ۱۶ مئی ۱۸۵۱ء ہے) مگر ان کا بلوچی یا براہوی کا کوئی دیوان لکھنے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

ملا محمد حسن کو خان محراب خان کی شہادت اور بہت ساری سازشوں کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا پھر بھی اس کی موقع شناسی، سفارت کاری اور ریاستی امور پر مکمل دسترس نے ان کو نائب سے وزیر بنا دیا مگر آخر میں وہ قید کی صعوبتوں میں گرفتار ہو کر دو سال کے بعد اپنے خالق سے جا ملے۔

ان کی شہرت ان کی بدنامی کا باعث بنی مگر ان کی شاعری کام آئی اور آج تک اپنی شاعری کے نام سے زندہ ہے بلکہ بلوچستان کے اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر ملا محمد حسن ہی ہیں اس لیے یہ کہنا کہ اردو رابرٹ سنڈیمن اور بیتھو رام پنجاب سے لے کر بلوچستان میں وارد ہوئے، درست نہیں ہے کیونکہ ان دونوں کے آنے سے پہلے ۱۸۱۰ء سے یہاں پر اردو کے اثر و نفوذ کے آثار ادبی و سیاحتی طور پر ملتے ہیں جب یہاں کے بارے میں پوٹنگر کی انگریزی نوشت سفر کے علاوہ اردو میں کافی سفری و جغرافیائی احوال و سرگزشت موجود ہے جن میں مقامی و غیر مقامی لکھنے والے حضرات شامل ہیں۔

ہاں البتہ ۱۸۷۶ء کے معاہدہ کے بعد جب سنڈیمن کوئٹہ میں ریذیڈنٹ متعین ہوئے تو انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو ہی ورنیکلر زبان کے طور پر سرکاری دفاتر و ماتحت عدالتوں میں متعارف ہوئی۔ اسکولوں کے قیام کے بعد دیسی سکولوں میں اردو

تدریسی ذریعہ بھی بن گئی کہ فارسی مسلمان شہنشاہیت (مغلیہ دور) کے زوال کے بعد اپنی افادیت یہاں بلوچستان میں بھی کھو چکی تھی۔ بلوچستان کا آدھا حصہ مغلیہ سلطنت اور آدھا حصہ صفوی حکومت کے زیر اثر سیاسی طور پر تھا مگر بمپور کے بلوچ بادشاہوں، مکران کے ملکوں، سندھ کے میروں اور قلات کے خوانین کے دربار میں فارسی زبان دفتری، عدالتی و ادبی زبان تھی۔ سندھ میں ۱۸۵۴ء میں سندھی کو انگریز نے رائج کر دیا مگر بلوچستان میں بلوچی رائج نہیں کی جیسا کہ پنجاب میں پنجابی کو اور سرحد میں پشتو کو رائج نہیں کیا گیا۔ شاید انہی کی دیکھا دیکھی بلوچستان میں بلوچی کو نظر انداز کیا گیا جو آج تک اسی صورت میں نظر انداز ہو رہی ہے مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بلوچی کا لکھنا اور پڑھنا آزادی کے بعد یعنی ۱۹۴۷ء کے بعد رواج پا گیا جو ۱۹۵۰ء میں کراچی سے ریڈیو پاکستان کی بلوچی کی نشریات کی برکت سے ممکن ہوا اور پھر کوئٹہ اسٹیشن سے ۱۹۵۶ء میں بلوچی نشریات کا باقاعدہ اجرا مرکزی حکومت نے شروع کیا اور مرکزی حکومت نے بلوچی ماہنامہ "اولس" کا اجراء ۱۹۶۱ء میں کر کے بلوچی زبان کی نشر و اشاعت کو مزید وسعت دی لیکن بلوچی اکیڈمی کے قیام کے بعد مالی گرانٹ کی قلیل رقم کے سوا صوبائی حکومت نے بلوچی زبان کے فروغ کے لیے کوئی ٹھوس قدم نہیں اٹھایا اور جب ۱۹۷۰ء میں بلوچستان صوبہ کا قیام عمل میں لایا گیا اور ۱۹۷۲ء میں جب عوامی نمائندہ حکومت قائم ہوئی وہ ایک ایسی پارٹی کی جماعت تھی جس کے منشور میں بلوچی کو کم از کم پرائمری لیول تک ذریعہ تعلیم اور بعد میں سرکاری دفتروں میں رائج کرنے کا بنیادی اہم نکتہ بھی شامل تھا مگر سیاست بازی کی ستم ظریفی دیکھیے کہ مرکزی حکومت کی طرف سے صوبوں کو اپنی زبانوں میں تدریس و تعلیم اور صوبائی دفتروں میں ان کو اپنا جائز مقام دینے کے لیے کہا گیا۔

سندھ حکومت نے اس سلسلہ میں کافی پیش رفت کی مگر بلوچستان نے بلوچی کو رائج کرنے کی بجائے بلوچی رسم الخط کو عربی سے بدل کر رومن اسکرپٹ میں بدلنے اور بعد میں لکھنے پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ شروع کرنے کے منصوبہ پر عمل کرنے کے لیے ایک سیمینار منعقد کیا جس کی بلوچ اہل دانش و علم نے بشمول ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کے اس تبدیلی کی مخالفت کہ رومن کو بلوچ قوم کی ثقافت تہذیب اور مذہب سے کوئی تعلق نہ تھا مگر انہوں نے قرارداد پاس کر کے اس پروسس کو روک دیا اور دفتری زبان اردو کو قرار دیا تا کہ سندھ اور مرکزی حکومت جو دوسری پارٹیوں کی تھیں ان کے لیے سیاسی مسئلہ پیدا کیا جائے اور ہوا بھی یہی۔ بلوچی کے آگے بڑھنے کا سفر رکا تو نہیں مگر بہت دھیما پڑ گیا اور اردو زبان آج تک دفتری زبان مکمل طور پر نہ بن سکی گو کہ بابائے اردو ۵۱۔۱۹۵۰ء میں کوئٹہ تشریف لائے تو آپ نے واضح الفاظ میں کہا تھا کہ اردو کو سرکاری زبان بنانے اور وسعت دینے کے لیے مقامی زبانوں سے استفادہ کرنا ضروری ہے کہ اس سے عوام میں ادبی شعور بیدار ہوگا۔

مگر افسوس کا مقام ہے کہ اس دانشمندانہ و صحت مندانہ مشورہ کو صوبائی حکومت نے خاطر خواہ اہمیت نہیں دی جو انجمن ترقی اردو کوئٹہ کے قیام کے مقاصد کے دو بنیادی نکات تھے۔ شاید انہی کی بدولت یحییٰ بختیار اور نواب اکبر خان بگٹی اس انجمن کی صدارت کے لیے منتخب ہوئے تھے۔ نواب اکبر خان بگٹی ۷/ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو سنڈیمن ہائی سکول کے ہال میں بابائے اردو کی زیر صدارت جلسہ میں انجمن کے صدر چن لیے جاتے ہیں اور یہی نواب اکبر خان بگٹی ۳۰ سال بعد حکومتی ناروا پالیسیوں کے سبب کئی

سال تک اردو بولنا ترک کرتے ہیں کہ ملک کو سیاسی طور پر بابائے قوم اور لسانی طور پر بابائے اردو کے بنیادی اصولوں کے خلاف چلایا جا رہا تھا۔ بلوچ عوام اور اشرافیہ کو فارسی کے بعد اگر برصغیر کی کسی زبان سے کوئی تہذیبی یا روحانی انسیت رہی ہے، وہ اردو ہی سے رہی ہے۔ یہ انہی کی رسم الخط میں اور انہی کے لفظوں کی تزئین میں عربی، عجمی اور ہندی ادب، شاعری اور کلچر میں ایک نئے صوت آہنگ میں ابھر کر سامنے آئی تو اس میں ''غیریت'' کی بجائے ''اپنائیت'' محسوس کی گئی کہ انگریزی استبداد نے اس خطہ کے مسلمانوں کے دل میں جو غیریت اور نفرت کا لاوا ابھر دیا تھا اس نے آپسی اپنائیت اور محبت کو مزید فروغ دیا۔ تحاریکِ آزادی اور ان سے منسوب ادب نے جو کہ اس زبان میں تھا اس ملی وحدت اور قومی یگانگت کو دوبارہ استوار کر دیا جو زوال مسلم حاکمیت کے بعد انحطاط پذیر ہو گیا تھا۔

بلوچستان میں میر یوسف علی خان عزیز مگسی کی سیاسی تحریک، ادب اور صحافت کے حوالے سے انتہائی منفرد و ممیز مقام رکھتی ہے پھر انہوں نے مسلمان نامور عالموں دانشوروں شاعروں سیاسی مفکروں اور اکابرین کی تعلیمات کا گہرا مطالعہ بھی کیا تھا اور بہت سوں سے ذاتی مراسم بھی تھے ان میں سرسید احمد خان، علامہ اقبال، مولانا ظفر علی خان اور مولانا محمد علی جوہر سب میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ میر یوسف عزیز مگسی بلوچستان کے پہلے سیاسی راہبر ہیں جنھوں نے تحریک کو فکری اور عملی جہت میں ہر طرح سے استوار کیے رکھا۔ مولانا ظفر علی کا ان سے عقیدت کا یہ اظہار کتنا برجستہ ہے:

تم کو خفی عزیز ہم کو جلی عزیز — عارض کا گل تمہیں ہمیں دل کی کلی عزیز
لفظِ بلوچ مہر و وفا کا کلام ہے — معنی ہیں اس کلام کے یوسف علی عزیز

اور میر یوسف عزیز مگسی کی اپنی نظم جو دسمبر ۱۹۳۲ء کو کل ہند بلوچ کانفرنس جیکب آباد میں پڑھی گئی تھی، کتنی جذبات انگیز تھی:

میں اگر چاہوں تو ذرے کو بیاباں کر دوں — قطرۂ آب میں پیدا بر طوفاں کر دوں
یہ ارادہ ہے کہ اسلام کا خادم بن کر — ساری دنیا کو نئے سر سے مسلماں کر دوں
پھر وہی بھولا سبق یاد دلا دوں سب کو — ہر بلوچی کو غرض عامل قرآں کر دوں
اسی ایقان براہیم کا وارث ہوں عزیزؔ — اب بھی آتش کو اگر چاہوں گلستاں کر دوں

۲۵ سالہ اس بلوچ نوجوان نواب زادہ کے ان اشعار نے نہ صرف حاضرین جلسہ کے دلوں کو گرما دیا تھا بلکہ ان کی حدت آج بھی دلوں میں اسی طرح محسوس کی جا سکتی ہے اور آپ کا یہ عزم صمیم اس نظم میں کتنے بھرپور انداز میں اظہار پاتا ہے جو آپ نے جلاوطنی کے سفر میں قاہرہ سے لندن جاتے ہوئے دوستوں کو بھیجی تھی۔

اپنی خوشی سے آپ ہوا ہوں جلاوطن

قسم اس درد کی جصے میں آیا جو نبوت کے
قسم اس جوش کی پہلو میں آیا جو محبت کے
کہ اپنے ملک سے داغ غلامی دھو کے چھوڑوں گا
بلوچستاں کو آزادی کی مے پلوا کے چھوڑوں گا
سبق دے کر اخوت کا، شجاعت کا محبت کا
میں پھر بگڑی بلوچستان کے بنوا کے چھوڑوں گا
میں پھر اعلان کرتا ہوں، میں پھر اقرار کرتا ہوں
کہ اے اہل وطن جس وقت تم مجھ کو بلاؤ گے
مجھے سر باز دیکھو گے، مجھے جانباز پاؤ گے

(زمیندار لاہور ۱۴ اپریل ۱۹۳۴ء)

لندن سے واپسی پر وہ کوئٹہ آئے تو ۳۱ مئی ۱۹۳۵ء کے خوفناک زلزلہ میں شہید ہو گئے۔ بلوچستان کا ۲۸ سالہ شاعر، ادیب، صحافی اور رہنما عین شباب میں ان سے چھن گیا۔ ڈاکٹر کوثر صاحب کا یہ تبصرہ ملاحظہ ہو:

''موصوف بوقلموں صلاحیت لے کر آئے تھے جوان کی بے قرار روح کے زیر اثر شعلہ ہائے جوالہ کی طرح کام کرتی تھی۔ انہوں نے کمال خود اعتمادی اور دوررس قوت تصور کے ساتھ اردو زبان کو آزاد زندگی کی ان بے تاب امنگوں سے ہم آہنگ کر دیا جو بلوچستان کی رگ و پے میں رقصاں و فروزاں تھیں اور عمل و بیداری کے پیغام کے لیے، اسی زبان کو عصائے موسوی کے طور پر استعمال کیا۔ ان کا افسانہ ''تکمیل انسانیت'' نہ صرف ان کی ذاتی زندگی کے مدوجزر کا مظہر ہے بلکہ ان کے سماجی شعور پر دلالت کرتا ہے۔ بلکہ بلوچستان کو جس اتحاد واشتراک کی ضرورت تھی اس کی روح بھی مجسم ہے جو مقصدیت ان کی زبان اور پیرایہ کے ساتھ مل کر اسے بلوچستان اور پاکستان کی نسل نو کے لیے مشعل راہ بنا دیتی ہے۔''

مگر آپ کے دوستوں اور ساتھیوں نے اس سیاسی اور ادبی سفر کو جاری رکھا۔ ڈاکٹر انعام الحق کوثر نے آگے لکھا ہے:

''اس دور کے لکھنے والے جیسے میر عبدالرحمٰن بگٹی، محمد حسین عنقا، قاضی داد محمد، میر شیر علی نسیم نکوی، اسلم اچکزئی، محمد حسن نظامی، میر عبدالعزیز کرد، عبدالصمد خان اچکزئی وغیرہ بھی یوسف عزیز کی نگارشات سے صوری اور معنوی طور پر متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

''اس دور کے مطالعہ سے ایک نہایت اہم حقیقت جو سامنے آئی ہے کہ ان ارباب قلم میں کوئی صاحب بھی یقیناً ''اہل زبان'' نہ تھے لیکن انہوں نے جس روانی اور قدرت سے اردو زبان کو ذریعۂ اظہار بنایا اس سے اس بات کا ثبوت بہم پہنچتا ہے کہ ان صاحبان کو یقین تھا کہ اردو اور صرف اردو ہی اس ملک کی عام زبان ہے اور ملت اسلامیہ کے متفرق اجزاء کی شیرازہ بند ہے......''

میں سمجھتا ہوں یہ نہ صرف اس ایقان کا اظہار ہے بلکہ تہذیبی اپنائیت اور یگانگت کا ایک درخشندہ باب ہے۔ جو اس بے آب و گیاہ خطے میں کھلا تھا جس نے سوچنے والے بلوچ ادیب، شاعر اور سیاسی کارکن کی صحیح سمت میں رہنمائی کی تو آزادی کے بعد اردو زبان و ادب بلوچستان میں ترقی کی اسی منزل کو جا پہنچا ہے جو اس کی ملی و مملکتی زبان کے کردار کو مزید تقویت دیتا رہا۔

انگریز بہت پہلے برصغیر میں پہنچ چکے تھے بلکہ ان کو اس ملک میں پہنچے ہوئے سو سال سے بھی زیادہ ہو چکے تھے۔ فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں قائم ہو چکا تھا۔ کلکتہ پہلا باقاعدہ شہر تھا جس کو انگریز نے آباد کیا تھا کہ پلاسی اور بکسر کی لڑائیوں میں ہندوستانی قوتوں کی شکست کے نتیجہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو حقیقی اقتدار مل چکا تھا۔ انہوں نے مغل شہنشاہ، شاہ عالم کے ساتھ معاہدہ الہ آباد کیا جس کے نتیجہ میں ۲۶ لاکھ کے عوض انگریزوں کو بنگال اور بہار کے دیوانی حقوق حاصل ہو گئے مگر کمپنی اپنے دفاتر مال و عدالتوں میں اپنی زبان رائج نہ کر سکی کہ شہنشاہ عالم نے ان دفاتر میں فارسی کو برقرار رکھنے کی شق رکھوا کر اپنی تہذیبی و ثقافتی برتری کو قائم رکھنے کی ایک کامیاب کوشش ضرور کی تھی جو کم از کم لسانی حد تک تقریباً ۷۰ سال تک برقرار رہی مگر اقتدار کے مضبوط ہوتے ہی انگریز نے اس شق کو ایک سنگین غلطی قرار دیا اور سر چالس گرانٹ نے ''ایک مفتوح قوم کی ناقابل فہم زبان (فارسی) کو اپنے دفاتر میں رائج کرنے کو قابل نفرت عمل قرار دیا''۔ اس لیے بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کا یہ فرمانا بالکل درست ہے کہ:

> ''غالب قوم جب کمزور اور مغلوب قوم کو کچلنا اور مٹانا چاہتی ہے تو سب سے پہلے اس کی زبان کو مٹانے کی کوشش کرتی ہے کہ زبان کے مٹانے سے قوم کی تہذیب و روایت ہی نہیں مٹ جائے گی بلکہ قوم کی روح بھی فنا ہو جائے گا۔''

لیکن جہاں تک انگریزوں کا تعلق ہے وہ ہندوستان پر قابض ہونے کے بعد بھی ہندوستانی زبانوں کو مٹانے کی پالیسی پر عمل پیرا نہ ہو سکا جیسا کہ برٹرنڈ رسل نے کہا تھا اور درست کہا تھا کہ سامراجی قوتیں اپنی سیاسی بالادستی، حربی برتری کی بدولت تو قائم کر لیتی ہیں مگر ثقافتی بالادستی کبھی قائم نہیں کر سکتیں۔ قدیم متمدن دنیا کی قوموں کی ثقافتی روح اس کی متحمل نہیں ہو سکتی ہے وہ فرد اور معاشرہ دونوں کو مزاحمت پر ابھارتی رہتی ہے۔ اس لیے ہندی ثقافت، اسلامی تہذیب اور عجمی زبانوں کے ملاپ نے اس روح کو اردو کے مظہر میں زندہ رکھا تو انگریز نہ اس ہندوستانی زبان اور نہ دوسری قومی و علاقائی زبانوں پر ڈیڑھ سو سال تک اپنا ثقافتی تسلط قائم کر سکا اس حقیقت کے باوجود کہ انگریزی زبان اشرافیہ کی نہ صرف زبان تھی بلکہ اعلیٰ علوم، دفاتر و عدالتوں میں اسی کا راج تھا اور اسی ماہیا ز فلاسفر نے مغربی طاقتوں کو متنبہ کیا کہ پرانی متمدن دنیا اور ایشیا کی مہذب ثقافتوں کو زیر کرنے کی کوشش مت کرو کہ ان کی تاریخ مزاحمت سے بھری پڑی ہے۔ اگر تم نے اس ثقافتی حقیقت کو تسلیم نہیں کیا تو تم اپنے گھر میں سکون سے نہ رہ سکو گے۔ اس دانا فلاسفر کی معقول رائے کو پرے رکھ کر امریکی دانشور ہنٹنگٹن نے تہذیبی تصادم کا جو خود ساختہ نظریہ پیش کیا اور امریکی پالیسی سازوں نے اسے قبول کر لیا تو اس کا انجام ہمارے سامنے ہے۔ انگریز اور امریکی دانشوروں میں یہ فرق ان دنوں نمایاں تھا جو بلیئر اور بش کے دور تک پہنچتے پہنچتے ختم ہوتا ہوا نظر آ رہا ہے۔

انگریز فارسی کو بنگال اور بہار میں پون صدی تک محکمہ مال اور عدالتوں میں استعمال کرتے رہے مگر بعد میں جیسا کہ پہلے ذکر کیا ہے وہ فارسی کو دفاتر، عدالتوں اور درس گاہوں سے خارج کر چکے تو ہندوستانی (اردو، ہندی) کو رائج کر دیا اور پھر باقی ہندوستانی مقامی زبانوں کی سرپرستی بھی کی جیسا کہ سندھ میں سندھی کو رائج کر دیا اردو کو پنجاب میں رائج کر دیا کہ اردو بہت سے

پنجابی دانشوروں کے خیال میں پنجاب کی قومی زبان ہےاور پنجابی دہلی اور لکھنو تک پہنچتے پہنچتے ان کے علاقائی لہجوں اور بجوں میں ڈھل کر زیادہ شستہ اور شائستہ ہو گئی تھی۔ جن دنوں اردو کو پنجاب میں ورنیکلر زبان کے طور پر رائج کیا گیا تھا موجودہ شمالی مغربی سرحدی صوبہ پنجاب کا حصہ تھا اس لیے وہاں پر بھی اردو رائج ہو گئی مگر بلوچستان میں بنا پوچھے اردو کو رائج کر دیا گیا کہ انگریز نے خان قلات سے مل کر ۱۸۷۱ء میں گولڈ سمڈ لائن کھینچ کر بلوچستان کو دو حصوں میں بانٹ دیا اور ۱۸۷۶ء کو اسی خان سے معاہدہ جیکب آباد کے ذریعہ بلوچستان اور سندھ میں بلوچوں کے بیچوں بیچ خط تقسیم استوار کر دیا اور ۱۸۷۷ء کو ڈیرہ غازی خان کے ڈپٹی کمشنر کیپٹن سنڈیمن کو اس کے دفتر سپرنٹنڈنٹ لالہ بھیو رام سمیت کوئٹہ میں ریذیڈنٹ متعین کر کے اردو کو بلا کسی خلش کے دفتری زبان بنا دیا اور فارسی کو گولڈ سمڈ کے اس پار دھکیل دیا اس طرح فارسی زبان ہندوستان بدر ہوتے ہوتے بلوچستان بدر بھی ہو گئی اور یوں اسلامی سیاسی وتہذیبی بالادستی کا آخری باب بھی بند ہو گیا تو اعلیٰ افسروں کے لیے اعلیٰ محکموں اعلیٰ عدالتوں میں انگریزی زبان رائج ہو گئی اور ماتحت افسروں، عدالتوں میں نیٹو معاونوں کے ذریعے اردو رائج ہو گئی کہ ہندوستانی مسلمانوں نے اس امتزاجی ہندی زبان کو (جس کو بہت ناموں سے منسوب کیا گیا تھا) اپنی اسلامی تہذیبی رسم الخط (عربی) میں لکھنا شروع کیا تھا اور اس کو اردو کا جامع اسم گرامی دے کر شروع ہی سے ہندی سے الگ کر دیا تھا تو اس نے ہندی مسلمان اور ہندی ہندو کے درمیان پہلی دفعہ ایک واضح مذہبی تہذیبی سرحد وضع کر دی تو اردو شمال مغربی ہندوستان میں مسلمانوں کے اتحاد اور ایک حد تک شناخت کا موجب بن گئی۔ اسی نے آگے چل کر پاکستان کی بنیادوں کو استوار کیا۔

انگریز نے فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں انگریزوں کو ہندوستانی (اردو، ہندی) کے علاوہ فارسی، عربی، سنسکرت، بنگلہ، تیلگو، مرہٹی، پنجابی (گورمکھی) میں تعلیم دی اور اسی طرح ہندوؤں نے بھی انگریزی اور یورپی زبانوں کے علوم میں کافی دسترس حاصل کی مگر مسلمان ماتم کرتے رہے کہ فارسی اور عربی کو دفاتر وعدالت سے نکال کر تدریس کے نئے انداز، انگریزی میں وضع کر کے ان کی ملی لسانی وحدت کا خاتمہ کر دیا گیا تھا۔ سرسید احمد خان نے مسلمانوں کے لیے علی گڑھ میں انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں تدریس وتعلیم کا بندوبست کر کے اس وحدت ملی کو مسلمانوں کے دلوں میں پھر سے جگا دیا کہ نئی زبان جس کے کئی نام تھے اس کو اردو سے اسم بامسمّٰی بنا کر عربی وفارسی کے رسم الخط میں باقاعدہ تعلیمی وتدریسی زبان کا درجہ دے کر اس وحدت ملی کی راہیں استوار کی گئیں اور اسی تحریک نے مسلمانان ہند میں مسلم تشخص کو بھرپور طریقے سے ابھارا تو کانگریس پارٹی کے مقابلہ میں مسلم لیگ پارٹی ۱۹۰۶ء میں بن گئی۔

مارچ ۱۹۴۰ء کو پہلی دفعہ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ ملک کا ٹھوس مطالبہ سامنے آیا جس میں بنگال کے مسلمانوں نے بھرپور شرکت کی بلکہ شیر بنگال مولوی فضل حق نے معروف تاریخی قرارداد لاہور ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو پیش کی جس کو مسلم لیگ نے حقیقتاً طور پر اپنا کر پاکستان کی بنیاد رکھ دی مگر ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو وہ بنیاد ہل گئی اور مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا۔ بنگالی مسلمان بنگلہ زبان اور یہاں تک کہ بنگلہ رسم الخط کو بدل کر عربی فارسی رسم الخط میں ڈھالنے کے لیے تیار نہ تھا اور وہاں پر ان کی زبان کو اس املاء میں لکھنے کے لیے وہاں کا عالم طبقہ تیار نہ تھا جیسا کہ سندھ میں اس کے علماء تیار ہوئے تھے کہ سندھی زبان کو دیوناگری کے ساتھ ساتھ عربی رسم الخط میں لکھنے کا عمل عربوں کے آنے کے بعد ہی شروع ہو چکا تھا جیسا کہ پنجابی کو گورمکھی اور شاہ مکھی میں لکھنے کا ابھی تک رواج ہے۔

Script رسم الخط یا زبان لکھنے کے طریقے کا بنیادی طور پر تعلق Scripture سے رہا ہے یعنی آسمانی صحیفوں کو لکھنے کا کام کاتب ہی کر سکتے تھے، جس طرح کا تقدس صحیفوں کو حاصل رہا ہے وہ تقدس صحیفوں کے طرز تحریر کو حاصل رہا ہے۔ اس لیے کوئی بھی قوم اپنی زبان کو چھوڑنے یا اس کے رسم الخط کو ترک کرنے پر آسانی سے راضی نہیں ہوتی ہے کہ زبان، ثقافت، عقیدہ اور رسم الخط کا ربط ہی سماجی، سیاسی و قومی وحدت و یگانگت کا نہ صرف وسیلہ جانا جاتا ہے بلکہ اس کو برقرار رکھنے کا ضامن بھی ہوتا ہے۔ مجھ سے چند سال پہلے بنگلہ زبان کے ایک معروف عالم نے کہا کہ ہم نے فارسی اور عربی کے ہزاروں الفاظ بنگلہ میں یوں سمو لیے ہیں کہ اب وہ بنگالی شمار ہونے لگے ہیں، اس لیے کہ ہم نے اپنے اسکرپٹ کو نہیں بدلا ہے مگر بلوچ کو اس قسم کا مسئلہ کبھی درپیش نہیں رہا ہے کہ ان کی زبان اوستا سے مشتق ہے جو زرتشت کے الوہی پیغام کا وسیلہ بنی تھی اور ایک ایسی رسم الخط میں لکھی جاتی رہی جو کہ صرف علماء و دستور کے لیے تھا۔ قادسیہ کی عرب پرشیا جنگ سے پہلے بلوچوں نے عربوں سے اس شرط پر ساتھ دینے کے عہد نامہ پر دستخط کر دیے ہیں کہ عرب بلوچ کو برابری کی سطح پر قبول کرے گا نہ کہ موالی کے طور پر، یعنی بلوچ نے ماسٹر کلائنٹ کے رشتہ کو عربوں کی آمد کے ساتھ ہی رد کر دیا اور ایک برابر کی برادر قوم کی حیثیت سے ان کے شانہ بشانہ آگے بڑھتا رہا اور پھر حکومت فارس نے بھی ہتھیار ڈال دیے تو تمام اقوام عجم نے اسلام کو کاملاً قبول کر لیا۔ فارس کی زبانیں عربی رسم الخط میں لکھی جانے لگیں تو وہ بھی ترقی کی منزلیں طے کرتی ہوئی جب سندھ اور ہند تک پہنچیں تو بلوچ کو اپنی گل زمین پر نہ ذوالمذہبی، نہ ذواللسانی اور نہ ذوالخطی کا مسئلہ درپیش تھا کہ اس نے ہزاروں سال پہلے اہورا مزدا کی وحدانیت کو تسلیم کر کے دیو اور دیوتا کی پرستش کو چھوڑ دیا تھا اور دیوناگری طرز تحریر کا شروع سے استا، زند، پارسی، پہلوی، دری، بلوچی، پشتو یا ترکی سے کوئی تعلق نہ رہا ہے کہ انڈو آریائی اور پرشو آریائی زبانوں کی خط تقسیم ہر لحاظ سے واضح رہی ہے اور اسلام لانے اور عربی رسم الخط کو اپنانے کے بعد یہ فرق مزید نمایاں ہوتا چلا گیا تو یہ سندھ ریجن تک پہنچ گیا۔

جناب اعتزاز احسن نے اپنی معرکۃ الآرا کتاب انڈس ساگا میں اس ریجن کو ہند سے علیحدہ تشخص کا حامل ہزاروں سال پہلے سے قرار دیا ہے کہ تاریخی، ثقافتی، سیاسی و لسانی عوامل کو مصنف نے معروضی عدسے سے دیکھ کر پاکستان کی ان تمام بنیادوں کو ایک نئی جہت دے کر بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے مجھے یقین ہے کہ اس بنیاد پر اس بڑے کام کو آگے بڑھایا جائے گا اور اس ملک کے کثیر اللسان کثیر القومی سیاسی تشخص کو سائنسی و علمی خطوط پر استوار کر کے اس تنوع کو ایک اچھوتے انداز میں پھلنے پھولنے کا حقیقی موقع دیا جائے گا تا کہ سومیرین تہذیب اور انڈس و ہڑپہ کی تہذیبی جڑوں کو ان کی حقیقی زمین سے پیوست کر کے ایک روشن خیال، جمہوری پاکستان کو اسلامی تہذیب اور مقامی قومی ثقافتوں اور زبانوں کی قوت نمو کے نئے ابھرتے خطوط پر صحیح معنوں میں استوار کر کے اقوام عالم کے دوش بدوش بنی نوع انسان کی بقا کی جدوجہد و صلح کل کے دھارے میں اس کے صحیح کردار کے تناظر میں فعال بنایا جا سکے جو یقیناً کامیابی سے ہمکنار ہو گا۔ لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم سب مل کر فیصلہ کریں کہ اردو کو لشکر کے خطوط پر نہیں بلکہ تہذیبی و ثقافتی خطوط پر پاکستان کی دوسری قومی زبانوں کو ساتھ لے کر آگے بڑھیں گے اور اردو کو پاکستان کی سرزمین کی مملکتی زبان بنا کر بانی پاکستان کے خواب کو حقیقت میں بدل دیں گے۔

E:\makhzan\picture for 14\New Folder\2.jpg not found.

محسن احسان

سرحد میں اردو

صوبہ سرحد اور اردو کا موضوع بڑا پھیلاؤ رکھتا ہے۔کم وقت میں ڈھائی صدیوں پر پھیلا ہوا اردو زبان و ادب کا حوالہ مشکل کام ہے۔ اردو زبان و ادب کی خدمت ہر دور اور عہد میں اہل فکر و نظر کرتے رہے ۔صوبہ سرحد گیارہ اضلاع پر مشتمل اور اس کی آبادی چار کروڑ عوام پر مشتمل ہے۔اس میں مختلف زبانیں اور بولیاں بولنے والے اور مختلف اصناف ادب و زبان سے لاتعداد لکھنے والے موجود ہیں۔ہر بڑے شہر، گاؤں، قصبے، دیہات کے گلی کوچوں میں بسنے والے اردو بولتے، سمجھتے اور جانتے ہیں۔خوشی کی بات ہے کہ صوبہ سرحد نے اردو زبان اور اس کے وسیع تناظر اور عوامی مطالبے کے تحت سرحد کی سرکاری زبان کا درجہ دے دیا ہے۔اور گزشتہ ڈھائی تین برس سے سیکرٹری صاحبان اور دیگر اراکین حکومت اور کارکنان دفاتر کی میزوں پر اردو لغات سے کام لیا جاتا ہے۔ سمریاں اردو میں لکھی جاتی ہیں۔سرکاری سطح پر فیصلے بھی اردو میں تحریر کیے جاتے ہیں۔میری معلومات کی حد تک یہ کارروائی دیگر صوبوں میں ابھی تک ناپید ہے۔دیگر صوبے اس مثال کو سامنے رکھیں۔

ضرورت اس بات کی بھی ہے کہ تمام قوانین کو اردو میں منتقل کیا جائے۔ TV کے پروگراموں میں کمپیئرز کو ہدایت کی جائے کہ انگریزی کے استعمال کو کم سے کم کریں۔مقامی لوگوں کے لب ولہجہ کے استعمال پر اعتراضات کم کیے جائیں۔فیڈرل اردو یونیورسٹی برائے سائنس اور ٹیکنالوجی کراچی اور اسلام آباد کی طرح پشاور میں بھی فوری طور پر اردو یونیورسٹی قائم کی جائے تاکہ اس علاقے کے باشندوں کو بھی اپنی قومی زبان میں درس وتدریس میں آسانیاں میسر آئیں۔

حکومت سرحد علمی، ادبی، تحقیقی، سائنسی اور ٹیکنالوجی کے مضامین کو اردو میں منتقل کرنے کے سلسلے کی حوصلہ افزائی کرے۔ کاغذ کی گرانی کتب کی اشاعت کے سلسلے میں ٹھوس اقدامات کیے جائیں۔ہماری نوجوان نسل لائبریریوں کی طرف بالکل رجوع نہیں کرتی۔ان کے ذوق وشوق کتب کو بڑھانے کے لیے ہر علاقے میں ایک جدید لائبریری کا قیام عمل میں لایا جائے جہاں جدید ٹیکنیکی سہولتیں میسر ہوں۔کمپیوٹر اور انٹرنیٹ سیکھنے اور سکھانے کے عمل کو تیز کرکے نئی نسل کو سہولتیں مہیا کی جائیں اور روزگار کے مسائل کا حل بھی نکلے۔

متحدہ عرب امارات، کوریا، تھائی لینڈ وغیرہ نے اپنی زبانوں کو اپنا کر ترقی پذیر ممالک میں ایک مقام حاصل کر لیا ہے ہم مگر ساٹھ برس کی طویل مدت پر اپنی زبان کو سرکاری سطح پر متعارف نہ کرا سکے۔ چین، جاپان اور دیگر ممالک اپنی زبان کو سرکاری سطح پر متعارف کروا کے بہت سے ممالک پر افضلیت حاصل کر چکے ہیں۔

حفیظ جالندھری نے تقریباً پچھتر برس پہلے درہ خیبر پر نظم لکھتے ہوئے کہا تھا:

نہ اس میں گھاس اگتی ہے نہ اس میں پھول کھلتے ہیں

مگر اس سرزمیں سے آسماں بھی جھک کے ملتے ہیں

اس شاعرانہ دعویٰ کے برعکس صوبہ سرحد کی سنگلاخ اور بے آب و گیاہ سرزمین پر اردو زبان کی سرسبز و شاداب گھاس بھی اگی اور شعر و سخن کے تر و تازہ اور رنگارنگ پھول بھی کھلے جن کی خوشبو صوبہ سرحد کی سرحدوں سے نکل کر پورے برصغیر میں پھیلی اور اب تو بین الاقوامی سطح پر جہاں جہاں اردو بولی، پڑھی، لکھی اور سمجھی جاتی ہے اس کی مہک پہنچ چکی ہے۔ بیدل نے شاید اردو زبان کے پھیلاؤ اور مستقبل کے بارے میں ٹھیک کہا تھا:

بہ اختیار نہ رفتیم ہر کجا رفتیم

غبار ما و دل تکم صید فتراک است

میں اس بحث سے گریز کرتے ہوئے کہ اردو زبان کی ابتدا کب کہاں کیسے اور کیوں کر ہوئی پروفیسر محمود شیرانی کے اس دعوے کو تسلیم کرتا ہوں کہ اردو کی داغ بیل اس دن پڑنا شروع ہو گئی تھی جب مسلمانوں نے برصغیر کو اپنے لیے مستقل ٹھکانہ سمجھ کر اس میں آباد ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔ بقول ڈاکٹر انور سدید "فارغ بخاری کا یہ دعویٰ بھی غلط قرار نہیں دیا جا سکتا کہ مسلمانوں کے اولین قافلے خیبر کے دشوار گزار راستوں سے برصغیر میں پہنچتے رہے اس لیے امکان ہے کہ اردو کا اولین روپ ترک شاہ سوار اور مغل شہزادے سا پنے راہوار ان تیز گام کے گرد و غبار کے ساتھ لائے اس کی ابتدائی صورت، اس کا رنگ ڈھنگ اس کا روپ و روغن کیا تھا اور اس میں مقامی زبانوں کے کتنے فی صد الفاظ شامل تھے، اس کا تحقیقی تجزیہ کرنا ایک مشکل عمل ہے۔ البتہ اس کے مشعل بردار طورخم پشاور اور لاہور کے راستے سے گزرتے ہوئے اس زبان کے بیج کچھ اس بے نیازی سے بکھیرتے رہے کہ وہ بیج کئی صدیوں کے بعد ہندوستان کی سرزمین میں تن آور درخت کی صورت میں سائے پھیلانے لگا تو اس کے پیکر میں ان مشعل برداروں کے لہو کی کچھ بوندیں بھی شامل تھیں۔"

پروفیسر محمود شیرانی اور فارغ بخاری کے دعوؤں کو تسلیم کرتے ہوئے اس زبان کی ابتدائی نشو و نما صوبہ سرحد اور پنجاب کو دی جا سکتی ہے۔ خاطر غزنوی نے اپنی تحقیق میں ہندکو کو اردو زبان کا ماخذ قرار دیا ہے۔ اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اردو کے ابتدائی خد و خال ہندکو میں موجود ہیں۔ اور اردو ہندکو کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ یہ دکنی سے مماثلت رکھتی ہے اور اس کے الفاظ صدرا اور الفاظ ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ خاطر غزنوی کے اس نقطۂ نظر کو فتح محمد ملک نے جذباتی صداقت نہیں بلکہ سائنسی حقیقت قرار دیا ہے۔ تاریخی حقائق اور لسانیات کے سائنسی نظریات کی روشنی میں ایک طویل تہذیبی سیاق و سباق میں اردو کے آغاز و نشو و نما پر روشنی ڈالی ہے۔

انہوں نے دلائل سے ثابت کیا ہے کہ ہندکو کیسے آہستہ آہستہ اردو کے قالب میں ڈھل گئی۔ اسی طرح شاہ جہان اور جہانگیر کے دور میں پشتو کے دو نامور شعرا خوشحال خاں خٹک اور رحمان بابا نے پشتو اور فارسی کے ساتھ ساتھ تخلیق شعر و سخن کے لیے اس زبان میں تخلیقات کا سلسلہ جاری رکھا۔

خوشحال خاں خٹک کا نمونہ کلام:

پہ سینہ کے م اودہ مینہ پھر جاگی　　　زما دستا محبت گواہ کیسے لاگی

اور رحمان بابا نے یہ کہا:

بہ دھلے تو مارا کجا بات ہے　　　کہ وصل تو خیلے بڑی بات ہے

برصغیر کے ہر علاقے کی سیاسی، معاشی، معاشرتی، تہذیبی، ثقافتی، علمی، ادبی، تحقیقی، تنقیدی اور تخلیقی سرگرمیوں کی داستانیں اردو میں سموئی ہوئی ہیں۔ صوبہ سرحد کے مختلف علاقے بھی اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ اس وقت اس علاقے میں اردو، پشتو، فارسی، ہندکو کے علاوہ سرائیکی، کوہاٹی، کھوار، یدغہ، کلاشہ، بلولہ کوہستانی، گوجری، پہاڑی، بلتی، شینہ، بروشکی، کنڈل شاہی، پشئی اور دیگر کئی بولیاں بولی جاتی ہیں۔ قیام پاکستان سے تقریباً ڈھائی صدیاں پہلے بھی اردو زبان صوبہ سرحد کے علاوہ دور افتادہ بستیوں میں بھی اپنے چھوٹے موٹے اثرات رکھتی تھی۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بقول ڈاکٹر ممتاز صادق اردو فارسی کے شانوں پر سوار ہو کر داخل ہوئی اس کی نگرانی میں آنکھیں کھولیں اور پاؤں پر کھڑا ہونا سیکھا اور جب قدرے سیانی ہو گئی اور یہاں کے کوہ و دمن سے مانوس ہو گئی تو نہ صرف فارسی سے آنکھیں ملانے لگی بلکہ اس کے سارے اثاثوں پر قبضہ جما کر اسے بے دست و پا کر گئی۔

فارسی آٹھ سو سال تک ادبی سیاسی سرکاری تہذیبی ثقافتی اور درباری سطح پر حکمرانی کرتی رہی۔ اس عروج کے بعد اس کا زوال شروع ہوا۔ سرحد کے مختلف علاقوں کی بولیاں بولنے والے جب تلاش رزق میں دربدر پھرتے تو ان کی جھولیوں میں رزق کے ساتھ دوسری زبانوں کے کچھ الفاظ، جملے، محاورے، ضرب الامثال، کہاوتیں اور لہجے بھی موجود ہوتے۔ اس کے علاوہ مختلف پیشوں سے وابستہ پیشہ وروں کے اوزاروں کے نام، پیشوں کے انداز اور طریق کار بھی محفوظ ہوتے۔

عوام کی اکثریت ہی زبان کے فروغ اور پھیلاؤ کا باعث بنتی ہے۔ نئے نئے تقاضے، ذہنی تہذیبی اور ثقافتی ارتقا کے ساتھ ساتھ زبان کی وسعت اور کشادگی کے چراغ جلاتے ہیں۔ اس کی مقبولیت صرف ادیبوں شاعروں سے نہیں ہوتی تا آنکہ زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے افراد کا عمل دخل نہ ہو اور مختلف شعبوں اور پیشوں کے لوگ اسے اپنا ذریعۂ اظہار نہ بنائیں۔ اس میں وسعت، گہرائی، حرکت، توانائی اور قوت پیدا نہیں ہو سکتی قیام پاکستان کے بعد اس کی مقبولیت میں اور اضافہ ہوا۔ پشاور میں پہلا مشاعرہ ۱۸۹۷ء میں اسلامیہ کلب بیرون کابلی دروازہ منعقد ہوا۔ آغا جگر کاظمی مرحوم لکھتے ہیں کہ:

"۱۸۹۷ء کا سورج چمکا اردو زبان، رات کے تھکے ماندے ستاروں کی طرح یہاں نورانی منظر دکھا رہی تھی۔
کہاں دلی، کہاں پشاور مگر اس لشکری زبان میں بلا کا جذب ہے ایک لحاظ سے اردو زبان کے جنم دن سے ہی

> یہاں شعرا اورادبا پائے جاتے ہیں مگر ہم جس دن سے آئے ہیں یہاں اردو زبان میں مشاعرے منعقد ہوئے اور ادب اردو کی بنیاد پڑی۔"

۱۹۵۴ء میں پشاور سے اردو کا پہلا اخبار "مرتضائی" چھپا۔ ۱۸۵۸ء میں مولوی نصیر احمد نے "پیام حق" جاری کیا اور اس کی تیس کاپیاں مولوی نصیر حمد نے اپنے ہاتھ سے لکھ کر تقسیم کیں۔ اس کے بعد ایک طویل سلسلہ چل نکلا۔ سہ روزہ، ہفت روزہ، پندرہ روزہ اور پھر روزناموں کی اشاعت کا آغاز ہوا۔ اس وقت پندرہ کے قریب روزنامے چھپ رہے ہیں، جن کی شناخت ملکی سطح کی صحافت میں ہوتی ہے۔ اردو کے علاوہ پشتو زبان کے معروف لکھاری ان میں کالم نویسی کرتے ہیں اور معاشرے میں ہونے والی سیاسی، معاشی، معاشرتی، تہذیبی اور ثقافتی تبدیلیوں کا جائزہ لیتے ہیں اور رویوں کا تجزیہ کرتے ہیں۔ پشتو لکھنے والوں کی اردو میں کالم نویسی ایک مثبت رجحان کی آئینہ دار ہے۔ ان کالموں میں پشتو کے محاورے ضرب الامثال پشتو الفاظ، پشتو اشعار اور ان کا ترجمہ صحت مند رویئے کا غماز ہے۔ ان دونوں زبانوں کے لکھنے والوں کو قریب سے قریب تر لانے اور ان کے درمیان ذہنی ہم آہنگی پیدا کرنے میں بڑا کارآمد ہے۔ پشتو اردو لسانی روابط کے سلسلے پرول خٹک کی کتاب اہمیت وافادیت رکھتی ہے۔ پریشان خٹک نے اردو اور پشتو کے مشترک الفاظ کے سلسلے میں اٹوٹ لسانی رابطہ میں پانچ ہزار سے زائد الفاظ تلاش کیے ہیں۔

انتظار حسین کا خیال درست ہے کہ:

> "زبانیں اور تہذیبیں کبھی خالص نہیں رہتیں ان کی لطافت کثافت ہی کے راستے جلا پاتی ہے۔ اردو میں یہ لفظ اور لہجے بے جوڑ نظر آنے کے باوجود بالآخر زبان میں گھل مل جاتے ہیں اور اس کی وسعت وکشادگی کا باعث بنتے ہیں۔"

رابطے کی اس زبان میں مختلف علاقوں کے لوگوں نے اپنے لہجے کی شیرینوں کے ساتھ علاقائی زبانوں کے الفاظ بھی اردو میں بڑے بے تکلفی سے داخل کردیے ہیں۔ صوبہ سرحد میں افغانستان کی سرحد پر واقع پاڑہ چنار شمالی وزیرستان اور جنوبی وزیرستان سے لے کر چترال، گلگت اور بلتستان ولداخ کی سرحدوں تک اردو نے اپنی شناخت منوالی ہے۔ قیام پاکستان کے بعد اس کی قبولیت میں اور اضافہ ہوا ہے۔ چترال کافرستان اور بلتستان کا علاقہ پہاڑوں اور گھاٹیوں میں گھرا ہوا ہے جہاں سنسکرت، فارسی دری اور کھوار (چترالی) کی زبانیں صدیوں سے بولی جاتی ہیں لیکن اردو کے اثرات ان تمام بولیوں پر موجود ہیں۔ اردو مختلف علاقوں کے تاجروں کے توسط سے یہاں وارد ہوئی۔ مذہبی علما اور مشائخ عظام نے بھی اردو کی مقبولیت میں خاص کردار ادا کیا۔ ان کی اردو کتابیں، درس، خطبا اور مذہبی اجتماعات نے عوام میں جڑیں پھیلانے میں معاونت کی۔ ادبی انجمنوں کا قیام، بیت بازی کے مقابلے، اردو مباحثوں اور مضمون نویسی کا اہتمام چترالی اور اردو زبان میں مشترک اقدار وروایات کی پاسداری کا سراغ ملتا ہے۔ اردو اور کھوار کے لسانی روابط پر عنایت اللہ فیضی، بادشاہ منیر بخاری کی تحریریں اہمیت کی حامل ہیں۔ بلتستان کے اہل قلم بھی اردو زبان وادب کے فروغ کے لیے خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ غلام حسین علی صبا بلتستانی اور محمود حسن حسرت فروغ اردو کے سلسلے میں اہم نام ہیں۔ دور دراز کے

علاقوں میں پاکستان کے مختلف صوبوں سے آئے ہوئے فوجیوں کی تعیناتی بھی اردو کی مقبولیت کا سبب ہے۔ سکولوں کالجوں اور کتب خانوں کا قیام اور ادبی انجمنوں کی سرگرمیاں بھی نیک فال ہیں۔ ساٹھ اور ستر کی دہائی میں گلگت سے لے کر پاراچنار تک مقامی اور صوبائی سطح پر منعقد ہونے والے مشاعرے اور ادبی اجتماعات بھی اردو کی نشو ونما میں قابل قدر اقدام کے حامل ہیں۔ ان دور افتادہ علاقوں میں ریڈیو اور ٹی۔ وی کے پروگراموں نے بھی اردو کی مقبولیت میں بہت اضافہ کیا ہے لیکن میڈیا کے ذریعے معاشرتی اقدار کی پامالی اور سماجی اعتبار سے پسماندگی کے ساتھ ساتھ اردو ڈراموں میں انگریزی زبان کا کثرت سے استعمال ہمارے ذہنی زوال کی نشان دہی بھی کرتا ہے۔ کمپیر زخواتین و حضرات کا یہ رویہ اور پروگراموں میں شامل اکثر شرکا کا یہ انداز گفتگو ان علاقوں میں خاص طور پر کھٹکتا ہے جن میں اردو اور پاکستان سے شدید محبت رکھنے والے دیہاتی باشندے آباد ہیں۔ پڑھے لکھے حضرات کی نجی محفلوں میں بھی اس موضوع پر گفتگو ان کی ناپسندیدگی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

افغانستان کی بدلتی ہوئی سیاسی، معاشی اور معاشرتی صورت حال نے بھی گزشتہ ربع صدی میں پشاور اور اس کے گردونواح میں آبادیوں کو بے حد متاثر کیا ہے۔ افغانستان سے آنے والے مہاجرین مختلف علاقوں سے آ کر یہاں تلاش امن، تلاش رزق اور تلاش روزگار میں آباد ہوئے۔ اس سے پشاور کا خصوصی اور صوبہ سرحد کا عمومی طور پر کلچر شدید متاثر ہوا ہے۔ وہ افغانی بچے جنھوں نے صوبہ کی سرزمین میں آنکھ کھولی یہاں کے اسکولوں میں ابتدائی تعلیم حاصل کی اور یہاں کے ہم جماعتوں اور دوستوں کے ساتھ جوان ہوئے اور یہیں شادیاں کر کے اپنے گھر آباد کیے، وہ فارسی کے ساتھ ساتھ اردو فر فر بولتے ہیں۔ اجنبیت کے احساس سے بیگانہ ہیں اور مقامی تہذیب و ثقافت کے اثرات کو قبول کر رہے ہیں۔ اور پرانے اثرات چھوڑ رہے ہیں۔ پشاور کے بیشتر علاقوں اور خصوصی طور پر حیات آباد اور گردونواح کی بستیوں میں آباد افغانی اپنی علیحدہ شناخت برقرار رکھنے کے لیے گھروں میں فارسی بولتے ہیں۔ لباس اور طرز بود و باش بھی وہیں کا ہے۔ مقامی آبادی سے اردو، ہندکو اور پشتو میں اظہار خیال کرتے ہیں۔ مشہور زمانہ باڑہ (جواب پاکستان کے ہر بڑے شہر میں موجود ہے) اور جہاں کروڑوں کا کاروبار خستہ حال سڑکوں کے کنارے آباد مارکیٹوں میں ہوتا ہے، مسلمان اور سکھ افغانی پاکستان کے چاروں صوبوں سے آئے ہوئے گاہکوں سے ساری گفتگو اردو میں کرتے ہیں۔ لیکن لہجے کا فرق ان کے علاقے کی غمازی کرتا ہے۔ اس تہذیبی اور لسانی آمیزش و آویزش نے زندگی کی قدروں پر بڑے اثرات مرتب کیے ہیں۔ ہندکو بولنے والی لڑکی کا پشتو یا فارسی بولنے والے گھرانے میں شادی ہو کر جانا بھی اس بات کی دلیل ہے کہ ان کا وسیلہ اظہار اردو ہی ہے۔ ہندکو پشتو اور فارسی بولنے والوں کی بیشتر آبادی اردو میں بات چیت کر کے شعوری اور لاشعوری طور پر اس درمیانی راستے کو اپنائے ہوئے ہیں۔ یہ ایسے عالم میں احساس کمتری یا احساس برتری کے بجائے احساس قرب و یگانگت سے سرشار نظر آتے ہیں۔ ہندکو اور پشتو کے بیشتر شعرا اردو میں شاعری کرتے ہیں، اردو مشاعروں میں شریک ہوتے ہیں اور ملکی و غیر ملکی سطح پر ایک منفرد اور جداگانہ اسلوب کے حامل ہیں۔ قیام پاکستان سے پہلے اور بعد میں نامور شعرائے کرام کی ایک پوری کھیپ اردو شاعری سے وابستہ نظر آتی ہے۔ ان شعرا نے نہ صرف قومی بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی نام و مقام کمایا ہے۔

صوبہ سرحد کے مختلف اضلاع میں بھی اردو زبان کی ترویج و ترقی کا کام مسلسل جاری ہے۔ایک تحقیق کے مطابق علامہ اقبال ۱۹۰۳ءاور ۱۹۰۴ء میں اپنے بھائی شیخ عطا محمد کے پاس آئے جوان دنوں ام ای ایس میں اوورسیر تھے۔بانگ درا میں شامل نظم "ابر" میں سرن پہاڑ کا ذکر ہے۔یہ ایبٹ آباد کے شرق میں واقع ہے اور کچھ عرصہ پہلے ایبٹ آباد کے شعرا نے یہاں مشاعرہ منعقد کر کے ان کی یادوں کو تازہ کیا۔اس میں سینکڑوں کی تعداد میں لوگ شریک ہوئے۔اقبال کی نظم کا پہلا شعر ہے:

اٹھی ہے آج وہ یورپ سے کالی کالی گھٹا

سیاہ پوش ہوا ہے پہاڑ سرن کا

ایبٹ آباد میں میر ولی اللہ ایڈووکیٹ کی علمی ادبی اور تعلیمی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ان کے علامہ اقبال کے ساتھ دوستانہ روابط تھے وہ کئی کتابوں کے مصنف تھے اور حافظ شیرازی کے کلام کا ترجمہ لسان الغیب سے کیا تھا۔ڈاکٹر سید عبداللہ نے جن کا نام بھی خود آپ اپنا تعارف ہے، مانسہرہ سے تعلیم حاصل کی اور پھر ایک بڑے ناقد کی حیثیت سے ادبی افق پر تابندہ رہے۔شوکت واسطی نے ملازمت کے قیام کے دوران گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد میں سید ضمیر جعفری کی معیت میں بے شمار مشاعرے کرائے۔ستمبر ۱۹۴۸ء کا مشاعرہ پہلا یادگار کل پاکستان مشاعرہ تھا جس میں حفیظ جالندھری، عبدالحمید عدم، عبدالعزیز فطرت کرم حیدری خمار دہلوی اور بہت سے نوآموز طلبا شعرا نے شرکت کی۔اس کے بعد برسہا برس تک یہ روایت زندہ رہی اور اب بھی یہ عمل جاری ہے۔ایبٹ آباد کالج میں اردو کی تدریس کا آغاز ۱۹۷۰ء میں ہوا اور اس وقت سے لے کر اب تک ہزاروں طلبا اردو ایم اے اور ایم فل کر چکے ہیں۔یہاں کئی ہندکو اور اردو کے نامی گرامی لکھنے والے موجود ہیں۔ایبٹ آباد کے گردونواح میں بھی کتنے اہل قلم پاکستان کی ادبی فضا میں اپنا نام و مقام پیدا کر چکے ہیں۔ان میں آصف ثاقب، قتیل شفائی، واجد رضوی، سعید خان، حفیظ اثر، الطاف پرواز، خالد خواجہ معروف ہیں۔

کوہاٹ میں انجمن ترقی اردو کا قیام ۱۹۴۵ء میں عمل میں آیا لیکن قیام پاکستان کے بعد اس کی سرگرمیوں میں اضافہ ہوا۔ ہفت روزہ ہمدم، مرحوم اختر ہمدم کی ادارت میں کوہاٹ میں ہونے والی سماجی، ثقافتی، تہذیبی اور ادبی سرگرمیوں کا احوال بڑے اچھے انداز میں چھپتا رہا ہے۔جسٹس رستم کیانی مرحوم سے لے کر احمد فراز تک بڑے نامی گرامی لکھنے والے اس سنگلاخ سرزمین سے نامور ہوئے۔ ایوب صابر کی قیادت میں انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام بڑی ادبی تقریبات منعقد کیں اور نئے لکھنے والوں کی ایک پوری نسل تیار کی جس نے عروسِ اردو کو نکھارا اور سنوارا۔

ڈیرہ اسماعیل خان جیسے پسماندہ علاقے میں بھی قیام پاکستان سے پہلے اور اس کے بعد اردو کی ترقی و ترویج کے لیے اہم کردار ادا کیا۔اس شہر میں ملازمت کے سلسلے میں مقیم شعرا میں عبدالحمید عدم مرتضیٰ برلاس، شوکت واسطی، نصیر احمد زار کے علاوہ کئی اور حضرات بھی رہائش پذیر رہے جن کی کاوشوں سے اس شہر میں فروغ اردو کا سلسلہ جاری و ساری تھا۔ساٹھ کی دہائی میں حزب اللہ خاں، سعید احمد اختر، اسّی کی دہائی میں غلام محمد قاصر اور نوے کی دہائی میں خاور احمد، شہاب صفدر، طارق ہاشمی اور طاہر شیرازی جیسی پُر اعتماد آوازیں اٹھیں۔ آرٹس کونسل اور قاصر ادبی فورم نے علاقے میں سرگرمیوں کو زندہ رکھا اور اردو کتب کی اشاعت کا اہتمام کیا۔

۱۹۳۵ء میں آل انڈیا ریڈیو اور ۱۹٦۷ء میں پاکستان ٹیلی ویژن کا آغاز بھی خوش آئند تھا کہ ان دونوں اداروں نے اردو، پشتو اور ہندکو کے فروغ کے لیے نمایاں کردار ادا کیا۔ ان کی تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں کہ پاکستان کے ہر صوبے میں یہ موجود ہیں ان سے وابستہ خواتین و حضرات کی خدمات کے نام اور مقام سب پر عیاں ہیں۔ دور دراز کے دیہات میں ان کے پروگرام اشتیاق سے سنے اور دیکھے جاتے ہیں اردو زبان کی مقبولیت کا سراغ ملتا ہے۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد اس صوبے میں ملازمت کے سلسلے میں ریڈیو سے وابستہ غیر مقامی افراد کے نام اردو زبان و ادب کی تاریخ میں فراموش نہیں کیے جا سکتے۔ ان کا تذکرہ سرسری طور پر ضروری سمجھتا ہوں کہ ان کی کاوشوں نے نئے ذہنوں کی آبیاری ہوئی۔ ان میں ایس ایس نیازی، ن م راشد، الطاف گوہر، احمد ندیم قاسمی، ابو سعید قریشی، محمود نظامی، حامد عزیز مدنی، شاد امرتسری، باقی صدیقی، انصار ناصری، ایوب رومانی، قاری علی تجل، اظہار کاظمی اور حمید نسیم کے علاوہ کئی دوسرے نامور اہل قلم بھی وابستہ رہے۔

صوبہ سرحد میں اردو کے پہلے ناول نگار خان بہادر غلام حسن خان پشاوری تھے جن کے دو ناول "افشائے راز" اور "الماس" ۱۹۰۴ء اور ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئے۔ ان دونوں ناولوں کے واقعات اور کردار انگریزی ناولوں سے مستعار ہیں۔ پریم چند کے ناولوں سے پہلے یہ ناول اشاعت پذیر ہوئے تھے۔ خواتین ناول نگاروں میں نثار عزیز بٹ، فہمیدہ اختر کوہزئی، اور زیتون بانو نے بھی اپنے موضوعات میں سرحدی زندگی اور پشتون معاشرت کا تذکرہ کیا ہے اور مقامی زندگی سے کرداروں اور ان کے مسائل کے بارے میں لکھا ہے۔ رحیم گل نے کئی ناول اور افسانے لکھے لیکن دو ناول 'جنت کی تلاش' اور 'داستان چھوڑ آئے' بڑے مقبول ہوئے۔ رحیم گل نے قتیل شفائی کے ہمراہ "قصہ خوانی" اور "عجب خان" دو فلمیں بھی بنائیں۔ قتیل شفائی نے شاعری کے افق پر اپنی منفرد شناخت سے ادبی اور فلمی دنیا میں بڑا نام پیدا کیا۔ ضیا سرحدی نے فلمی دنیا میں نام کمایا اور ایک ناول "حد نگاہ" بھی لکھا۔

شوکت واسطی نے شاعر کے علاوہ مترجم کی حیثیت سے جان ملٹن کی پیراڈائز لاسٹ کا منظوم اردو ترجمہ ہومر کی ایلیڈ کا ترجمہ "آشوبیہ"، ڈانٹے کی ڈیوائن کامیڈی کا ترجمہ "کربیہ، طربیہ اور برزخیہ" کی صورت میں شائع کیے۔ ترجموں میں مشتاق شباب، قلندر مومند اور پشتو کے بہت سے افسانہ نگاروں اور شاعروں کے تراجم اردو دان طبقے کی سہولت کے لیے چھپ چکے ہیں۔ خوشحال خان خٹک، رحمان بابا، قاسم آفریدی، امیر حمزہ شنواری، اجمل خٹک، قلندر مومند زیتون بانو اور کئی دوسرے اہل قلم کے تراجم فارغ بخاری، رضا ہمدانی، خاطر غزنوی، طٰہٰ خان، مشتاق شباب، حبیب الرحمان اور راقم الحروف نے شائع کیے ہیں۔ حال ہی میں پشتو افسانے کے سو سال کے نام سے اردو میں اسیر منگل کی کتاب شائع ہوئی ہے جس میں تاریخی، تحقیقی اور تنقیدی طور پر پشتو کے ارتقا کا جائزہ لیا گیا ہے اور اردو افسانے کے قدیم و جدید رجحانات و اثرات کی نشان دہی کی گئی ہے۔

اردو زبان و ادب کی ترویج میں صوبہ سرحد کا حصہ بھی برصغیر کے کسی دوسرے حصے سے کم نہیں۔ بیسویں صدی کے آغاز سے ہی لکھنے والوں کی ایک تازہ دم نسل نگارِ سخن کی مشاطگی، اپنے پورے کمال فن سے کرتی رہی اور روایت سے وابستگی اور عصری تقاضوں کی آئینہ داری کو بھی ملحوظ خاطر رکھا۔

قیام پاکستان کے بعد ترقی پسند مصنفین کی بنیاد رکھی گئی۔ فارغ بخاری رضا ہمدانی اور خاطر غزنوی کی ادارت میں شائع ہونے والے ادبی رسالہ 'سنگِ میل' نے ادبی افق پر روشنی پھیلائی۔ لکھنے والوں نے انسانی مسائل، دکھ، درد، معاشرے میں پھیلی ہوئی خرابیوں اور سیاسی قلابازیوں کو موضوع بنایا اور سماجی مسائل پر بے دھڑک لکھا۔ انہوں نے فکری نظریاتی اور تحریکی وابستگی کے باوجود تخلیقی عمل میں آزاد پرندوں کی پروازیں رکھیں۔ انہوں نے اپنی شاعری اور خصوصاً اپنی غزل میں کھلی فضا قائم کی۔ اس نسل نے نئے مزاج اور اسلوب لب ولہجہ اور انداز کی آبیاری مکمل عصری آگہی کے ساتھ اپنے خونِ دل کی کشید سے کی۔ ان شعرا کے ہاں اردو فارسی اور انگریزی کے کلاسیکی شعروادب کے گہرے مطالعہ کے اثرات نمایاں ہیں۔ غزل کی صنف کو ناقدین نے بہت مطعون کیا مگر اس کی سج دھج اور بانکپن میں کسی بھی عہد میں کمی نہیں آئی۔ نگار غزل کے بانکپن کو سنوارنے اور نکھارنے میں صوبہ سرحد کے شعرا کا حصہ کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ قتیل شفائی، فارغ بخاری، شوکت واسطی، رضا ہمدانی، احمد فراز، خاطر غزنوی، محسن احسان، سجاد بابر، غلام محمد قاصر، سعید احمد اختر، روشن نگینوی، خاور احمد، یوسف رضا چشتی، نذیر تبسم، ناصر علی سید، عزیز اعجاز، تاج سعید، ماجد سرحدی اور ان کے بعد آنے والی نسل بڑی باشعور پُرعزم اور فن وادب سے لگاؤ رکھنے والی نسل ہے۔ اس نسل نے پوری دیانت داری سے بامعنی بامقصد اور باوقار نجی شاعری کر کے اس کے وسیع تر امکانات میں بھرپور اضافہ کیا۔ یہ سبھی شعرا ہندکو بولنے والے ہیں۔ پشتو بھی روانی سے بولتے ہیں۔ نجی محفلوں میں اور گھر کے افراد کے ساتھ ہندکو یا پشتو میں بات چیت کرتے ہیں۔ لیکن شاعری اور نثر میں اردو کو ذریعہ اظہار بناتے ہیں۔ اس لیے کہ قائداعظم نے اردو کو ملک کی سرکاری زبان کہا تھا۔ اور قائد کا احترام اور وقار اور فرمان پاکستان کی محبت کے ساتھ ساتھ دلوں میں زندہ و پائندہ ہے۔ صوبہ سرحد کے اردو ادب میں اور خصوصی طور پر شاعری میں انسانی رشتوں اور روایت و رابطہ کی ان گمشدہ کڑیوں کا سراغ ملتا ہے، جنہیں وقت، حالات اور زمانے نے منتشر کر دیا۔ ان لکھنے والوں نے اردو زبان وادب کو درسی، نصابی طور پر پڑھا سیکھا۔ اس کے ساتھ رغبت و محبت پیدا کی اہل فکر و دانش کی صحبتوں سے فیض اٹھایا۔ اس میں پشتون اہل قلم جو اردو میں کالم نویسی کرتے ہیں اور فکری بیداری میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ میں یہاں ان کے فرداً فرداً نام نہیں لوں گا کہ یہ فہرست بہت طویل ہو جائے گی۔

شعبہ اردو پشاور یونیورسٹی کی پچاس سالہ خدمات بھی قابل تحسین ہیں۔ ہزاروں کی تعداد میں طلبا اردو زبان وادب کی تحصیل کے بعد صوبہ سرحد کے مختلف اضلاع میں درس وتدریس کی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ اس شعبے کے رسالے "خیابان" نے چودہ بڑے ضخیم متعدد نمبر چھاپے ہیں۔ ان کے مدیران میں ڈاکٹر مظہر علی خان، پروفیسر طاہر فاروقی، خاطر غزنوی، ڈاکٹر شمس الدین صدیقی، مرتضیٰ اختر جعفری جیسے اہل علم و دانش شامل تھے۔ 'خیابان' کا نام ڈاکٹر مظہر علی خان کا تجویز کردہ تھا۔ ان اہم شماروں میں اقبال نمبر، غالب نمبر، شرر نمبر، طاہر فاروقی نمبر، دانائے راز نمبر، دو بڑے اہم اصناف سخن اور اصناف نثر نمبر بھی شائع کیے گئے۔ جن میں علمی وادبی حلقوں میں پاکستان کی سطح پر پذیرائی حاصل ہوئی۔ اصناف سخن نمبر میں مختلف اصناف، قصیدہ، مثنوی، رباعی، غزل، قطعہ، مرثیہ، واسوخت سانیٹ ہائیکو اور دیگر انگریزی اور فرانسیسی اصناف سخن جنہوں نے اردو شاعری کو مالا مال کیا شامل ہیں۔ اس طرح اصناف نثر نمبر میں

داستانوں کے علاوہ اردو ناول اردو افسانے کے ساتھ اردو ڈرامے پر نئی تحقیق اردو افسانے سے علامت نگاری تک اردو خطوط نگاری، تذکرہ نگاری، خودنوشت سوانح نگاری، خاکہ نگاری، انشائیہ، رپورتاژ پر تحقیقی مضامین شامل ہیں۔ اسالیب ادب کے تحت اردو تراجم، تحقیق کی روایت، تنقید نگاری، طنز و مزاح اور تفصیل نگاری پر مقتدر اہل قلم کے ساتھ طلبا و طالبات کی نگارشات بھی شامل ہیں۔ ان دونوں خصوصی نمبروں کی ادارت پروفیسر منور روؤف اور ڈاکٹر صابر کلوروی نے کی۔ اس شعبے کے سربراہوں میں ڈاکٹر مظہر علی خان، مولانا عبدالقادر، پروفیسر طاہر فاروقی، ڈاکٹر شمس الدین صدیقی، پروفیسر مرتضیٰ اختر، ڈاکٹر عبدالستار جوہر پراچہ، ڈاکٹر خاطر غزنوی، پروفیسر وحید غفور، پروفیسر اعجاز الرحمٰن اور پروفیسر ضیاء الرحمٰن نے کی اس وقت ڈاکٹر صابر کلوروی شعبے کے سربراہ ہیں اور گزشتہ ماہ یعنی ۱۷، ۱۸ اپریل کو انہوں نے شعبے کی طلائی جشن کی سہ روزہ تقریبات منعقد کیں۔ جس میں دور دراز علاقوں میں شعبے کے فارغ التحصیل اردو کے اساتذہ کو مدعو کیا گیا۔ شعبے سے جن طلبا نے پی ایچ ڈی ڈگری حاصل کی ان میں "اردو اور پشتو کے لسانی روابط" پر تحقیق ڈاکٹر جوہر پراچہ نے "سید مظہر گیلانی کی شخصیت و فن" پر، ڈاکٹر ناہید رحمان نے "سرحد میں اردو افسانے" پر، ڈاکٹر رختاج امین نے "اقبال کے نظریہ جمال" پر، فقیر احسان فقری نے "سرحد میں اردو غزل کا ارتقا" پر، ڈاکٹر نذیر تبسم نے "اردو غزل میں اسلوب زبان کے نئے تجربات" پر، ڈاکٹر طارق ہاشمی نے "رضا ہمدانی شخصیت و فن" پر، ڈاکٹر روبینہ شاہین نے "مظفر علی سید کی شخصیت و فن" پر شامل ہیں۔ ان کے علاوہ بہت سے طلبا و طالبات ایم فل اور ایم اے کے مقالات تحریر کر رہے ہیں۔ پی ایچ ڈی کے ان مقالات کی نگرانی خاطر غزنوی، نذیر تبسم، سہیل احمد، وحیدہ غفور اور صابر کلوروی نے کی۔ شعبہ اردو ہر سال باڑہ گلی میں اردو کے مختلف موضوعات پر سیمینارز منعقد کراتا ہے جن میں سرحد کے دور افتادہ علاقوں سے قدیم طلبا شرکت کرتے ہیں اور اہل فکر و دانش کے مقالات سے بصیرت کے مواقع میسر آتے ہیں۔ شعبہ اردو ایک سیمینار اقبال پر، ایک نصاب اردو اور تدریس پر، ایک صوبہ سرحد میں اردو کے ارتقا پر، ایک تحقیق کی رفتار پر، اور ایک مختلف اصناف ادب اور ایک اردو ادب کا عالمگیریت کے حوالے سے کروا چکا ہے۔ جن میں کثیر تعداد میں اساتذہ اور طلبا کو شرکت کر کے تبادلہ خیال کے مواقع میسر آتے ہیں۔ پشاور یونیورسٹی قابل ستائش ہے کہ ان سیمینارز کے انعقاد میں ہر ممکن امداد فراہم کرتی ہے۔ جولائی ۲۰۰۷ میں منعقد ہونے والا سیمینار بھی اس سلسلے کی اہم کڑی ہے۔

صوبہ سرحد میں انجمن ترقی اردو، بزم سخن، انجمن تحفظ اردو، اردو لٹریری سوسائٹی اور ادبستان انجمن ترقی پسند مصنفین بزم افکار بزم علم و فن ادارہ علم و فن، اباسین آرٹس کونسل، سنڈیکیٹ آف رائٹرز تحقیق انٹرنیشنل دامان آرٹس کونسل اور کئی دوسرے ادارے تمام اصناف میں اپنی اپنی بساط کے مطابق خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ اگر ان کو حکومت کی طرف سے سرپرستی، نگرانی اور سہولیات میسر ہوں تو یہ زیادہ فعال طریقے سے کام کر سکتے ہیں۔

نثر و نظم میں مزاح نگاری میں پطرس بخاری، مرزا محمود سرحدی اور مسعود انور شفقی بڑے اہم نام پیدا کیے ہیں۔ پطرس کی تحریریں اور مرزا محمود سرحدی کی شاعرانہ عظمت سب پر عیاں ہے۔ مرزا کا یہ قطعہ تو زبان زد خاص و عام ہے:

ہم نے اقبال کا کہا مانا
اور فاقوں کے ہاتھوں مرتے رہے

جھکنے والوں نے رفعتیں پائیں
ہم خودی کو بلند کرتے رہے

خواتین قلم کاروں اور خواتین اساتذہ کی بھی ایک بڑی تعداد اردو پشتو اور ہندکو لکھنے والوں کی موجود ہے جو اپنی نسائی مسائل سے آگاہی رکھتی ہیں اور ان کا تذکرہ اپنی تحقیق، تخلیق اور تنقید میں کرتی ہیں۔ نثار عزیز بٹ، زیتون بانو، رضیہ بٹ، منزہ اختر علی کوہ زئی سیدہ حنا، فیروزہ بخاری، بشریٰ فرخ، صبا جاوید، عابدہ مظہر شرف ثمینہ ربانی، منور رؤف ڈاکٹر پروین عظیم، شمیم خالق عطیہ ہدایت اللہ، وحیدہ غفور، روبینہ شاہ جہان یہ تمام نام شاعری، ناول نگاری، افسانہ نگاری اور تنقید کے اہم حوالے ہیں اور پاکستان کی سطح پر شناخت رکھتے ہیں۔ ان میں پختون معاشرے پختون ثقافت اور پختون زندگی کے مسائل موجود ہیں اور اپنے اپنے علاقوں کی زندگی کے معاشی معاشرتی، سیاسی اور اخلاقی زندگی کی آئینہ داری ملتی ہے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اردو اجتماعی زندگی کی ایک بنیادی ضرورت ہے اور اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے عوام اور حکومت کے درمیان یک آہنگی ہونا لازمی ہے۔

حال ہی میں اردو زبان کو ملک میں دفتری اور عدالتی زبان کے طور پر اختیار کرنے کے لیے وزیر اعظم پاکستان نے ایک کابینہ کمیٹی مقرر کی ہے جس میں اس سلسلے میں پیش کردہ سفارشات کا جائزہ لیتے ہوئے اس امر سے اتفاق کیا ہے کہ وفاقی اور صوبائی سطح پر مقابلے کے امتحانوں میں شریک ہونے والے امیدواروں کو اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں امتحان دینے کی سہولت فراہم کی جائے۔ تمام امتحانات میں عملی اردو کا پچاس نمبر کا پرچہ متعارف کروایا جائے۔ عدالتی زبان کو سرکاری طور پر اردو بنایا جائے۔ تمام ملکی تقریبات اور استقبالیوں میں اردو زبان استعمال کی جائے جس کے ساتھ ساتھ سرکاری مہمان کی زبان میں ترجمہ پیش کیا جائے۔ جوائنٹ سروسز کی پریڈوں اور عساکر پاکستان کی جملہ تقریبات کی کارروائی اردو میں کی جائے اور وفاقی اور صوبائی سطح پر حلف برداری کے موقع پر اردو زبان ہی کو استعمال کیا جائے۔ اگر ضروری ہو تو انگریزی یا کسی دوسری زبان میں ترجمہ کیا جائے۔ انگلش میڈیم تعلیمی اداروں میں اردو کو لازمی مضمون کے طور پر پڑھایا جائے تعلیمی اداروں میں اردو انگریزی اور دوسری علاقائی زبانوں کے فروغ کے لیے سادہ وقت اور وسائل مہیا کیے جائیں۔

یہ مقام اطمینان ہے کہ مقتدرہ قومی زبان نے عدالتوں میں رائج اینگلو سیکسن اور رومن قوانین کی اصطلاحات کا اردو ترجمہ شائع کر دیا ہے جو بڑا وقیع ہے۔ مقتدرہ قومی زبان نے اردو کمپیوٹر سافٹ ویر کی تیاری میں بھی اہم پیش رفت کی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ انگریزی زبان ایک عالمی زبان کی حیثیت سے دنیا کے ہر گوشے میں مقبول و محترم ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ جدید علوم اور سائنس کی زبان بن گئی ہے۔ اور اس میں مہارت اور دسترس رکھنا بھی بے حد ضروری ہے۔ اور اس کی تدریس کے لیے ہر ممکن کوشش بھی کرنا چاہیے۔ اس کا دانش مندانہ طریقہ یہ ہے کہ انگریزی زبان سکھانے کے لیے انہیں ہر قسم کی سہولتیں مہیا کی جانی چاہئیں۔ لیکن ساتھ ساتھ اردو اور دیگر علاقائی زبانوں میں منتقل کرنے کا عمل بھی جاری رہنا چاہیے۔ کیونکہ اس سے

ہے تو بھی برتنا عالمی ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ جانے کے مترادف ہے۔آخر میں ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کی اس بات پر گفتگو ختم کروں گا کہ جب کوئی غیر ملکی ہم سے پوچھتا ہے کہ آپ کے ملک کی سرکاری زبان کون سی ہے، دفتری کاروبار کس زبان میں ہوتا ہے؟ تعلیم کس زبان میں دی جاتی ہے؟ تو یقین جانیے گردن جھکا لینی پڑتی ہے۔کیونکہ ہر ملک نے اپنی قومی اور ملکی زبان کو سرکاری اور دفتری زبان بنایا ہوا ہے۔

سرحد میں اردو کی مقبولیت کا اندازہ ذوالفقار علی بخاری سرحد کے نامور فرزند کے ۸۵ سال پہلے کے اس شعر سے بھی لگایا جا سکتا ہے:

اے بخاری مرحبا صد مرحبا　　　تجھ کو اب اردو زباں آنے لگی

کتابیات

۱۔　معاصر،لاہور۔سالنامہ ۲۰۰۶

۲۔　قومی زبان،کراچی۔ نومبر ۲۰۰۶

۳۔　اخباراردو،اسلام آباد۔مارچ تا ستمبر ۲۰۰۶ء

۴۔　ادبیات سرحد۔فارغ بخاری،۱۹۵۱ء

۵۔　ایک کمرہ۔مصنف خاطر غزنوی

۶۔　سرحد میں اردو کا ارتقا۔ڈاکٹر انور سدید

۷۔　خیابان۔جرنل پشاور یونیورسٹی شعبہ اردو ۱۴واں شمارہ

۸۔　ادبیات۔اکادمی ادبیات پاکستان،اسلام آباد

۹۔　فنون۔انتظار حسین

\makhzan\pictu
for 14\New
Folder\11.jpg
not found.

ڈاکٹر انور سدید

پنجاب میں اردو

ایک ماہر لسانیات کا ارشاد ہے:

"کائنات کی سانس وقت کی ڈگر پر چل رہی ہے اور بولنے کی زبان سانس کی ڈور سے بندھی ہوئی ہے۔ خدا نے آواز بنائی اور انسان نے بولی، جو آواز ہی سے بنی ہے۔"[۱]

وہ واسطہ جس سے ہم دوسروں پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں "زبان" کہلاتی ہے اور یہ ایک ایسے صوتی سلسلے کا نام ہے، جو کہ انسان کے اعضائے نطق کے ذریعے ظہور میں آتا ہے اور اعضائے سماعی کے ذریعے سماعت پذیر ہوتا ہے۔[۲] یہ سماجی عمل دنیا کے مختلف خطوں اور مختلف اقوام میں الفاظ و اشتقاق، صرف و نحو، معانی و بیان اور بلاغت و صوتیات کے تحت زمانی و مکانی حالات کے مطابق جاری رہتا ہے اور اب اتنا ترقی کر چکا ہے کہ کسی زبان کے مطالعے کو ایک سائنس کی حیثیت بھی حاصل ہو چکی ہے اور بقول شخصے "معرفۃ اللغات" ایک علمی موضوع بن گیا اور انسان کی علمی تاریخ میں پہلی بار غیر ملکی زبانوں سے لاعلمی کے دور کا خاتمہ ہو گیا۔[۳] تاہم قدیم زبانوں کو منکشف کرنے اور مختلف زبانوں کے مابین الفاظ کے لین دین کا سلسلہ ختم نہیں ہوا اور حقیقت یہ ہے کہ جو زبانیں سماجی تعلقات میں دوسری زبانوں کے اثرات قبول کرتی اور اپنے ذخیرہ الفاظ میں اضافے کا عمل جاری رکھتی ہیں وہ ترقی یافتہ قرار دی جاتی ہیں اور جو زبانیں اس سے اجتناب کرتی ہیں وہ رابطہ عوام سے محروم ہوتے ہوئے لسانی تاریخ کا حصہ بن جاتی ہیں۔ ابن خلدون نے زبانوں کے تقابلی مطالعے کے سلسلے میں اپنے مقدمہ میں لاطینی زبان بولنے والوں کے متعلق کہا ہے کہ ان کا مطالعہ اور لکھنا پڑھنا ان کی اپنی ہی زبان تک محدود رہا۔[۴]

برصغیر کی قدیم زبان سنسکرت کو دیوتاؤں کی زبان قرار دے کر اونچی ذات کے ہندوؤں نے تقدس کے حصار میں لے لیا۔ اس میں کسی قسم کی ملاوٹ کو ممنوع قرار دے دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس زبان کا مذہبی وجود تو قائم رہا لیکن اس کا ارتقاء رک گیا، پھر یہ ختم ہو گئی اور اب اس کی تجدید مشکل نظر آتی ہے۔[۵] اس کے برعکس اردو زبان کی ابتداء، تہذیب اور فروغ میں سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ:

"اردو زبان کسی منصوبہ بندی کا نتیجہ نہیں بلکہ یہ ایک لالۂ خودرو ہے جس نے اپنی غذا برِ ہند کے مختلف خطوں کے عوام سے حاصل کی اور اس کے اثمار وسیع پیمانے پر تقسیم کیے۔ اردو زبان اولمپک کی اس شمع کی طرح ہے جس کا الاؤ تو ایک مرکزی جگہ پر روشن ہوتا ہے لیکن جس کی روشنی نگر نگر قریہ قریہ اور شہر شہر گردش کرتی ہے اور

لوگوں میں زندگی اور تحرک کی لہر دوڑا دیتی ہے۔ چنانچہ اردو کو مسلمانوں اور ہندوستانیوں کے معاشرتی امتزاج کا خوبصورت ترین ثمر قرار دیا گیا ہے۔"[۶]

لیکن یہ حقیقت بھی واضح ہے کہ مسلمان یہ زبان باہر سے اپنے ساتھ نہیں لائے تھے اور نہ اس زبان کو انہوں نے یہاں آ کر دفعتاً نافذ کر دیا تھا بلکہ یہ لسانی اختلاط کا نتیجہ تھی۔ اور یہ اختلاط برِ ہند کے ہر اس خطے میں ظہور پذیر ہوتا رہا جہاں مسلمانوں کی قدم آرائی کے آثار ملتے ہیں۔ اس ضمن میں دکن میں اردو کی ابتدائی نشوونما کا دعویٰ کیا گیا تو دلیل یہ دی گئی کہ دکن میں عربوں کے تجارتی روابط زمانہ قبل از اسلام سے قائم تھے[۷] اور تجارتی لین دین کی ضرورت ایک نئی مشترکہ قابلِ فہم زبان کو جنم دے سکتی ہے۔ سید سلیمان ندوی نے فرمایا:

"مسلمان سب سے پہلے سندھ میں پہنچتے ہیں، اس لیے قرین قیاس یہی ہے کہ جس کو ہم آج اردو کہتے ہیں، اس کا ہیولیٰ اس وادی سندھ میں تیار ہوا ہوگا۔"[۸]

ہندوستان میں حملہ آوروں کی یلغاریں شمال مغرب سے ہوتی رہی ہیں، حملہ آوروں کے ساتھ ہمیشہ افغانوں کے لشکر ہوتے تھے۔ فارغ بخاری نے اس اساس پر دعویٰ کیا کہ انہی لشکروں میں ایک نئی زبان کا ریختہ صوبہ سرحد میں تیار ہوا جس نے "لشکر" کی رعایت سے اردو کا نام پایا۔ مزید برآں افغانوں کے ساتھ یہ زبان ہندوستان کے کونے کونے میں پہنچی اور ان کی بستیاں ہی اس کا مرکز بنیں۔[۹]

مسلمان فاتحین کی نقل و حرکت اور غزنویوں کے سندھ، ملتان اور میرٹھ تک قبضے اور لاہور کے دارالحکومت ہونے کی وجہ سے حافظ محمود شیرانی نے کہا کہ عمالِ حکومت کے لیے اس ملک کی زبان کا سیکھنا ضروری تھا۔ علماء نے اشاعت دین کے لیے اس زبان کو اظہار کا ذریعہ بنایا۔ حافظ محمود شیرانی نے ملتانی، پنجابی اور اردو کی لسانی شباہتوں سے قریبی مماثلت ثابت کی اور پنجاب میں اردو کی تشکیل کے ضمن میں یہ استدلال پیش کیا:

"سندھ میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے اختلاط سے اگر کوئی نئی زبان نہیں بنی تھی تو غزنوی دور میں جو ایک سو ستر سال پر حاوی ہے اسی مخلوط یا بین الاقوامی زبان ظہور پذیر ہو سکتی ہے اور چونکہ یہ پنجاب میں بنی ہے اس لیے ضروری ہے کہ وہ یا تو موجودہ پنجابی کے مماثل ہو یا اس کی قریبی رشتہ دار ہو۔ بہر حال قطب الدین کے فوجی اور دیگر متوسلین پنجاب سے کوئی ایسی زبان اپنے ہمراہ لے کر روانہ ہوئے ہیں جس میں خود مسلمان قومیں ایک دوسرے سے تکلم کر سکیں اور ساتھ ہی ہندو اقوام بھی اس کو سمجھ سکیں۔"[۱۰]

سونیتی کمار چٹر جی نے بھی لکھا ہے کہ:

"پنجابی مسلمان جو ترک افغان فاتحین کے ہمراہ نئے دارالحکومت دہلی میں آئے ...... وہ دہلی میں اپنی بولی بولتے آئے تھے، جو دہلی کے شمالی اضلاع اور شمال مغربی علاقوں کی زبان سے حد درجہ مشابہت رکھتی تھی، انہوں نے اس زبان کو جو کاروباری زبان بن گئی تھی، لہجہ و آہنگ دیا اور اس کے نقش و نگار کو سنوارنے میں

اہم کردار ادا کیا۔"[۱۱]

"پنجاب میں اردو" کی بحث بیسویں صدی کے اوائل میں شیخ عبدالقادر کے رسالہ "مخزن" میں ۱۹۰۳ء میں شروع ہوئی۔اخبار "سول اینڈ ملٹری گزٹ"۔"اردوئے معلی" اور "پیسہ اخبار" لاہور نے بھی اس میں حصہ لیا۔اہل پنجاب کا دعویٰ تھا کہ:

"اردو زبان دراصل منجھی ہوئی پنجابی زبان ہے۔اس کے افعال عموماً پنجابی ہیں۔مگر تھوڑی سی نفیس تبدیلی کے ساتھ استعمال میں لائے گئے ہیں۔"[۱۲] (یہ بحث ۱۹۱۹ء تک جاری رہی تا آنکہ حافظ محمود شیرانی نے اس نظریے کو لسانی شہادتیں فراہم کردیں۔)

ڈاکٹر جمیل جالبی نے پنجاب میں اردو کے فروغ کے سلسلے میں پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی کے اس خیال کو بھی قابل توجہ قرار دیا ہے کہ:

"پنجابی کے بارے میں دو خاص باتیں ذکر کے قابل ہیں:

ایک تو یہ کہ شورسینی پراکرت کے آثار جس قدر پنجابی میں پائے جاتے ہیں اور آج تک موجود ہیں، اتنے کسی اور زبان میں نہیں پائے جاتے۔"

اور دوسرے یہ کہ غیر ملکی الفاظ سے مہمان نوازی کا برتاؤ سب سے پہلے اس کے حصے میں آیا"۔[۱۳]

انہوں نے اس ضمن میں شیر علی خان سرخوش کا یہ اقتباس پیش کیا کہ "اردو زبان کی نہایت ابتدائی شکل پنجابی میں ہے" اور "اردوئے قدیم پنجابی سے ماخوذ ہے"۔جالبی صاحب نے ان عوامل کا جائزہ بھی لیا جن کی بنا پر ایک ایسی تہذیبی و لسانی فضا تیار ہوئی جس میں اردو زبان کی نشو و نما کے لیے راستہ ہموار ہو گیا۔اجمال یہ ہے کہ:

۱۔ پنجاب کا نام مسلمانوں کا رکھا ہوا ہے۔یہ علاقہ ہمیشہ سے مختلف اقوام کی آماجگاہ یا راہ گزار رہا ہے...... یہاں کے لوگوں میں جذب و قبول، مہمان نوازی، کھلے دل سے نئی باتوں اور نئی چیزوں کو قبول کرنے کا رجحان زیادہ رہا ہے۔اس علاقے کی زبان نے بھی سب سے زیادہ بیرونی الفاظ قبول کیے۔

۲۔ مسلمانوں کا کلچر فاتح قوم کا کلچر تھا...... "عربی ایرانی کلچر" کی روح نے یہاں کی زندگی کو نیا رنگ روپ عطا کیا اور اس کے ساتھ ہی قدیم زبان کی بنیادوں پر اردو زبان کا نیا ہیولیٰ بھی تیار ہونے لگا۔

۳۔ قیاس غالب ہے کہ مسعود سعد سلمان (متوفی ۱۱۲۱ء) نے جو زبان اپنے ہندوی دیوان میں استعمال کی، وہ یہی زبان ہو گی جسے پنجاب میں ہاتھ پنجتی استعمال کرتے تھے۔اس زبان کا ایک نمونہ حسب ذیل ہے:

سوامی تم ہی گرو گوسائیں
امی جوشش سبد ایک بوجھا
فرانکھے چیلا کوئر بدھ رہے
ست گرو ہوئی سا پچھیا کہے۔"[۱۴]

ان حالات و عوامل کی بنیاد پر ڈاکٹر جمیل جالبی نے لکھا ہے:

"تاریخی شواہد، تہذیبی ولسانی دھارے اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ اردو کا مولد پنجاب ہے۔[۱۵] اس علاقے سے یہ زبان برعظیم کے طول وعرض میں پھیلی اور پھر مختلف لسانی وتہذیبی اثرات نے صدیوں کے سفر کے بعد جو شمال سے شروع ہو کر جنوب کے انتہائی گوشوں تک پہنچ گیا، اسے وہ شکل دے دی جو آج ہمیں نظر آتی ہے۔ اسی لیے پنجاب میں اس زبان میں تصنیف وتالیف کا سلسلہ ہمیں ابتدائی دور سے ہی نظر آتا ہے۔"[۱۶]

ڈاکٹر وحید قریشی نے ابتدائے اردو کی بحث کو ان الفاظ میں سمیٹا ہے:

"اردو کی ابتدا پاکستان میں ہوئی، اس کی ادبی ترقی، ادبی سرمایہ بیرون پاکستان تخلیق ہوا لیکن اس کا لسانیاتی نظام مقامی زبانوں سے مربوط ہے۔"[۱۷]

برصغیر کی لسانیات کی تاریخ کا یہ واقعہ حیرت انگیز ہے کہ پنجابی زبان جس نے اردو کو ایک مخصوص لہجہ، آہنگ اور محاورہ دیا اور اسے عام کاروبار کی سطح سے بلند کر کے پہلے شاعری کی بلند منزل تک پہنچایا اور پھر ادبی نثر اور علمی اظہار کے جاوے پر ڈال دیا، خود ارتقاء کے فطری مرحلے طے نہ کر سکی۔ حتیٰ کہ پنجاب میں "ماں بولی" ہونے کے باوجود اس کا رسم الخط بھی اختراع نہ کیا گیا جو اس کی سب آوازوں کو تحریر میں لے آتا۔ چنانچہ پنجابی نے اپنی بیشتر قوت اردو کے فروغ وارتقاء میں صرف کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پنجابی زبان کی اپنی سرگرمیاں علاقائی حدوں میں سمٹ کر رہ گئیں اور کچھ عرصے کے بعد جب لسانیات میں سیاست در آئی تو یہ سوال بھی اٹھایا جانے لگا کہ:

"اردو اور پنجابی کا آپس میں رشتہ کیا ہے؟"

مولانا صلاح الدین احمد نے جو اردو ادب کی غیر سیاسی شخصیت تھے فرمایا کہ "پنجابی ماں ہے اور اردو پنجاب کی بیٹی ہے۔"[۱۸] پروفیسر حمید احمد خاں نے پنجابی کو اردو کی حقیقی بہن کہا[۱۹]۔ گویا یہ ایک ہی بطن سے پیدا ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے لکھا:

"اردو زبان اور اس کے ادب سے پنجابی زبان اور اس کے ادب کا وہی رشتہ ہے جو دریائے سندھ سے پنجاب کے ان پانچ دریاؤں کا ہے جو پنج ند کے مقام پر ایک ہی دھارے میں منتقل ہو کر بالآخر دریائے سندھ میں جا گرتے ہیں۔"[۲۰]

اس کی وجہ یہ نظر آتی ہے کہ اردو کی جنم بھومی پنجاب ہے اور تا حال اس حقیقت کا بطلان نہیں کیا جا سکا کہ اردو کی داغ بیل تو اسی روز پڑنا شروع ہو گئی تھی جس دن مسلمانوں نے ہندوستان میں آ کر سکونت اختیار کی تھی۔ چنانچہ اگر یہ کہا جائے کہ سندھی، بلوچی، پشتو، ملتانی، پنجابی اور دیگر علاقائی زبانوں نے اس زبان کو ثروت مند بنانے اور اس کی تعمیر وتشکیل میں اور اب فروغ میں حصہ لیا ہے تو یہ غلط نہیں ہے۔ اور یہ بھی درست ہے کہ پنجابی پنجاب والوں کی، سندھی اہل سندھ کی، پشتو سرحد کے باسیوں کی اور بلوچی بلوچستان کے باشندوں کی ماں بولی ہے تو یہ بات بھی تسلیم کرنی پڑے گی کہ اردو پہلے پورے برصغیر میں سب سے زیادہ بولی اور سمجھی جانے والی زبان تھی اور اب پاکستان میں اسے قومی زبان کا درجہ حاصل ہے۔[۲۱] اردو چاروں صوبوں کے عوام کی رگِ جاں میں خون کی طرح

گردش کر رہی ہے اور پنجاب کے مسلمانوں نے اردو کی اس حیثیت کو ہمیشہ تسلیم کیا اور سر سید احمد خان نے اردو زبان کو قومی جہت عطا کی تھی اس کا پورا ادراک علامہ اقبال نے بھی کیا۔ انہوں نے اس زبان کو نہ صرف اظہار کے مؤثر وسیلے کے طور پر قبول کیا بلکہ اردو کی حمایت میں اپنی آواز ہمیشہ بلند کی اور ایک مرتبہ یہاں تک کہہ دیا کہ:

"میری لسانی عصبیت دینی عصبیت سے کسی طرح کم نہیں۔"[۲۲]

اور جب مولوی عبدالحق نے "آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس" کے ایک شعبے کی حیثیت میں انجمن ترقی اردو کی بنیا ڈالی تو علامہ اقبال نے مولوی عبدالحق کو لکھا:

"آپ کی تحریک سے ہندوستان کے مسلمانوں کا مستقبل وابستہ ہے۔ بہت سے اعتبار سے یہ تحریک اس تحریک سے کسی طرح کم نہیں جس کی ابتدا سر سید نے کی تھی"۔ (مکتوب ۱۴ اکتوبر ۱۹۲۶ء)[۲۳]

سر سید کی طرح اقبال کی نظر بھی مستقبل شناس تھی۔ انہوں نے فروغ و ترقی اردو کے سلسلے میں نہ صرف مولوی عبدالحق کو اپنے تعاون کی یقین دہانی کرائی بلکہ جب انجمن ترقی اردو کے صدر کے مستقر کا سوال پیدا ہوا تو اقبال نے مولوی صاحب کو لکھا:

"میرے خیال میں اس کا مستقر لاہور ہونا چاہیے اور اس کے لیے ایک سے زیادہ وجوہ ہیں۔

اول: مسلمانوں کو اپنے تحفظ کے لیے جو لڑائیاں آئندہ لڑنی پڑیں گی ان کا میدان پنجاب ہوگا۔ پنجابیوں کو اس میں بڑی بڑی دقتیں پیش آئیں گی کیونکہ اسلامی زمانے میں یہاں کے مسلمانوں کی مناسب تربیت نہیں کی گئی مگر اس کا کیا علاج کہ آئندہ رزم گاہ یہی زمین ہوگی۔

دوم: آپ انجمن ترقی اردو کے متعلق ایک پبلشنگ ہاؤس قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اس کی کامیابی بھی لاہور ہی میں ہو سکتی ہے کیونکہ لاہور ایک بڑا پبلشنگ سنٹر ہے اور بہت سا طباعت کا کام مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے۔ انگریزی پبلشنگ کی طرف بھی یہاں کے مسلمان توجہ کر رہے ہیں۔"

ایک اور خط میں انہوں نے لکھا:

"کاش! میں اپنی زندگی کے باقی دن آپ کے ساتھ رہ کر اردو کی خدمت کر سکتا۔"

یہاں یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ "انجمن پنجاب پراونشل ایجوکیشن کانفرنس سے جس کے سیکرٹری علامہ اقبال تھے، خان بہادر محمد شفیع نے یہ قرارداد منظور کرائی کہ:

"اس کانفرنس کی رائے میں اردو رسم الخط کا مسلمہ اول رہنا صوبہ پنجاب کی عام علمی اور تمدنی ترقی کے لیے ازبس ضروری ہے۔"

مولوی الف دین وکیل کیمبل پور نے اس جلسے میں یہ قرارداد پیش کی کہ:

"صوبہ پنجاب کے بالعموم اور مسلمانوں کے بالخصوص علمی اغراض اس امر کے متقاضی ہیں کہ اردو زبان کو ہی صوبہ پنجاب میں واحد ذریعہ تعلیم رہنے دیا جائے۔"[۲۴]

پنجاب میں اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کی یہ قرارداد نئی نہیں تھی بلکہ حافظ محمود شیرانی نے لکھا ہے:

"اردو زبان اس صوبے میں اس قدر مقبول رہی ہے کہ خود اہل پنجاب نے اس زبان میں نصاب تیار کیے ہیں۔ان میں سب سے قدیم مولوی اسحاق لاہوری کا ایک نصاب (فرح البیان) ہے جو بہ عہد شاہ جہان ۱۶۴۷ء کے قریب تالیف ہوتا ہے......بچوں کی تعلیم میں بھی اس زبان سے کام لیا جا رہا ہے۔"[۲۵]

اردو اور پنجاب کے تعلق سے ڈاکٹر جمیل جالبی کا جو خود اہل زبان ہیں (اور پنجابی نہیں) یہ اقتباس بھی بڑا معنی خیز ہے:

"اس (بیسویں) صدی کے اوائل میں جب اہل پنجاب اس بات کا دعویٰ کر رہے تھے کہ اردو کا مولد پنجاب ہے اور اہلِ زبان اس دعوے کو تسلیم کرنے میں پس و پیش کر رہے تھے، اس وقت تک قدیم اردو کے وہ مخطوطات سامنے نہیں آئے تھے جو ۱۹۲۰ء کے بعد شائع ہوئے اور جن کے مطالعے سے یہ بات سامنے آئی کہ:

پنجاب کا اردو سے وہی تعلق ہے جو ایک ماں کا اپنی بیٹی سے ہوتا ہے۔بیٹی بیاہ کر کہیں چلی جائے لیکن ماں کبھی ڈائن نہیں بن سکتی۔اس لیے اردو اور اہل پنجاب کا یہ رشتہ ناتا آج بھی اس طرح قائم ہے۔"

پنجاب کے مسلمانوں نے اس سطح پر ہمیشہ قومی نقطہ نظر کا ثبوت دیا اور کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ ۱۹۰۸ء میں جب ڈاکٹر پی،سی، چڑجی وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی نے سالانہ جلسہ تقسیم انعامات منعقدہ ۲۲ دسمبر ۱۹۰۸ء کی افتتاحی تقریر میں یہ تجویز پیش کی کہ صوبہ پنجاب کے مدارس میں اردو کے بجائے پنجابی زبان کو رائج کیا جائے تو علامہ اقبال، علی امام، منشی محبوب عالم، منشی سراج الدین اور دوسرے اہل علم اس تحریک کے خلاف نبرد آزما ہو گئے اور اسے ناکام بنا دیا۔اس دور کے اخبار اور رسالے اس بات کے شاہد ہیں۔ [۲۶]

میں یہاں بابائے اردو مولوی عبدالحق کی ان مساعی کا ذکر بھی کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے "جائزہ زبان اردو" کے نام سے ایک منصوبہ ۱۹۳۵ء میں انجمن ترقی اردو (ہند) کی ایک مجلس میں پیش کیا اور "اردو بنیادی تحریک" کو عوامی ریفرنڈم کا حصہ بنایا [۲۷]۔ اس مجلس کے صدر سر راس مسعود تھے اور اس میں شیخ عبدالقادر اور ڈاکٹر ذاکر حسین نے بھی شرکت کی تھی۔مقصد یہ تھا کہ اردو ہندی تنازعہ کے اس دور میں مختلف صوبوں اور ریاستوں میں عوام میں اردو کی مقبولیت اور استعمال اور ترقی کا جائزہ لیا جائے اور اس کی "کل ہند" برتر حیثیت کو اجاگر کیا جائے۔"جائزہ پنجاب" کا کام ڈاکٹر عبداللہ چغتائی صاحب کو تفویض ہوا اور مولوی عبدالحق نے تسلیم کیا ہے کہ انہوں نے بہت سرگرمی سے اس کام کو انجام دیا [۲۸]۔ اس جائزے میں نو سوالات دریافت کیے گئے، جن میں پہلا اور اہم ترین سوال یہ تھا:

آپ کے صوبے یا علاقے میں ایسے اشخاص کی تعداد جو:

(الف) اردو بولتے ہیں۔یعنی جن کی مادری زبان اردو ہے۔

(ب) اردو لکھتے پڑھتے ہیں یا لکھ پڑھ سکتے ہیں

(ج) اردو سمجھ سکتے ہیں۔

اس جائزے کی رپورٹ انجمن ترقی اردو پنجاب کے کنویز اور سیکرٹری خواجہ عبدالوحید نے قلم بندکی اور مولوی عبدالحق صاحب کو بھیج دی۔[۲۹] متذکرہ بالا سوالات کے جوابات مردم شماری کے سرکاری ریکارڈ سے حاصل کیے گئے جو حسب ذیل ہیں:

الف: کل پنجاب میں ہندوستانی (اردو) بولنے والوں کی تعداد ۳۹ لاکھ ۸۸ ہزار کے لگ بھگ

ب: اپنی مادری زبان (پنجابی وغیرہ) کے علاوہ اردو بولنے والوں کی تعداد ۹۹ ہزار سے زائد

ج: اردو سمجھ سکنے والوں کی تعداد ۳۵ لاکھ ۱۲ ہزار سے زائد [۳۰]

اس جائزے کے مطابق ۱۹۳۱ء میں پنجاب سے ۱۰۷ اردو ماہنامے، ۱۰۹ اردو ہفت روزے اور ۱۴ اردو روزنامے شائع ہو رہے تھے [۳۱]۔ ممتاز ادبی رسائل میں جو لاہور سے چھپتے تھے اور جن کا حلقۂ قرأت پورا ہندوستان تھا، ہمایوں، ادب لطیف، نیرنگ خیال، عالمگیر، ادبی دنیا، شاہکار، رومان، غزال، زیب النساء، نسوانی دنیا، اور رہنمائے تعلیم شامل ہیں۔ ان رسائل کے مدیران اردو کے کہنہ مشق ادبا تھے اور اس زبان کے ادب کو پروان چڑھا رہے تھے جس کا پہلا صاحب دیوان شاعر مسعود سعد سلمان (متوفی ۱۱۲۱ء) غزنویوں کے عہد میں دارالحکومت لاہور میں مقیم تھا [۳۲]۔ اردو سے پنجابی کی قربت اور مشابہت کی ابتدائی مثالیں فریدالدین شکر گنج، بابا نانک، شاہ حسین، سلطان باہو اور بلھے شاہ کے کلام سے دستیاب کر لی گئی ہیں اور وارث شاہ کی ٹھیٹھ پنجابی کے بارے میں پنڈت برجموہن دتا تریہ کیفی نے لکھا ہے:

> اگر ''ڑ'' ......اور ''ڑے'' کے لاحقوں کو اور چند مقامی خصوصیات کو نکال دیں تو وارث شاہ کی زبان اور ہماری انیسویں صدی کے ابتدائی برسوں کی زبان میں کم فرق پایا جائے گا۔'' [۳۳]

حافظ محمود شیرانی کی تحقیق کے مطابق ''اردو زبان میں سب سے قدیم تصنیفات تو وہی ہیں جو گجرات اور دکن میں دسویں اور گیارھویں صدی ہجری میں شائع ہوئیں۔ ان صدیوں میں ہی اہل پنجاب کی مقامی زبان یعنی پنجابی میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع ہوا۔ لیکن اہل پنجاب اردو زبان میں بھی دلچسپی لیتے رہے۔ مسعود سعد سلمان کے بعد تقریباً چار سو سال تک ''ہندوی زبان'' خانقاہوں میں پروان چڑھتی رہی۔ اس زبان نے مسافروں کے ساتھ سفر کیا اور ہر جگہ اپنے اثرات چھوڑے۔ امیر خسرو کی شخصیت اجتہادی تھی کہ انہوں نے ریختہ کی پہلی تحریک کو فروغ دیا۔ اور اس کی تقلید میں شاعری کا سکہ تبدیل ہونے لگا جس کے وسیع تر اثرات پنجاب نے بھی قبول کیے۔ دوسری طرف اردو کی ضرورت اور اہمیت کو تعلیمی سطح پر محسوس کیا گیا تو ابتدائی درجوں کے لیے نصاب بھی مرتب کیے گئے۔ وارث شاہ نے ایک نصاب ''خالق باری'' کا ذکر کیا ہے۔ حافظ محمود شیرانی نے ''فرح الصبیان'' (اسحٰق لاہوری) اور ''ذوق الصبیان'' (احسن اللہ احسن) کے نام لے کر فرمایا ''صوبہ پنجاب قدیم زمانہ سے اردو میں دلچسپی لے رہا ہے [۳۴]۔ شیخ جمالی کنبوہ، بہرام سقہ بخاری، عشقی خان عشقی اور حکیم یوسفی کی اردو نگاری نے محمد افضل جھنجھانوی کی ''بکٹ کہانی'' کے لیے زبان آراستہ کر دی اور چندر بھان برہمن اور شاکرانگی جیسے شاعر پیدا کیے۔

حافظ محمود شیرانی نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی پنجاب میں آمد (۱۸۴۹ء) سے قبل کی تالیفات میں مندرجہ ذیل کتب شامل کیں:

۱۔ مثنوی گلزار فقیر از غلام محی الدین بن قطب عالم شیخ محمد یوسف ساکن میرپور

۲۔ مثنوی رمز العشق از شاہ غلام قادر ابن شیخ محمد فاضل الدین بٹالوی

۳۔ مثنوی گنج شہیداں از غلام غوث بٹالوی

۴۔ ترجمہ "سیف الملوک وبدیع الجمال" از عاجز بٹالوی

۵۔ لغت "مفتاح الاخواہ" نصاب "ذوق الصبیان" اور "بخشش نامہ" از احسن اللہ احسن

۶۔ منظوم خط "یاران وطن" دیوان کے علاوہ متعدد مثنویاں از شاہ مراد لاہوری

۷۔ مثنوی سرکنون بہ تقلید رمز العشق۔ از فقیر اللہ (مرید شاہ امانت)

۸۔ مثنوی گُریز از حافظ مرتضیٰ

۹۔ مثنوی فتح الرمز، از نصرت شیخ نور محمد

۱۰۔ دیوان عشق پیچاں

حافظ محمود شیرانی نے صرف ان اردو گویوں کا ذکر کیا ہے جو صاحب تصنیف کہلائے جانے کے مستحق ہیں۔ تاہم انہوں نے چند مختصر اردو گویوں میں دلشاد پسروری، غنیمت کنجاہی، وارث شاہ، شیخ موسیٰ، فقیر نورالدین، فقیر عزیزالدین کو بھی شامل کیا ہے۔ [۳۵] انیسویں صدی کے نصف آخر میں پنجاب میں اردو کا ارتقاء کی تحقیق ڈاکٹر ممتاز گوہر نے کی ہے۔ تاہم انہوں نے بعض نئی شہادتوں سے ۱۸۴۹ء سے پہلے کا تاریخی اور ادبی پس منظر اور اردو سے اہل پنجاب کے عشق کی نشان دہی بھی کی ہے۔ ان میں تھو شاہ کلیم، مولوی احمد بخش یک دل، فقیر سید نورالدین منور، فقیر عزیزالدین رضا آزاد اور دینا ناتھ سوز کے نام اہم ہیں [۳۶]۔ ان کی شاعری کے نمونے حسب ذیل ہیں:

نہ پوچھ خونیں دلوں سے قصہ، خموش ہو، رہ، بلا نہ ہرگز
برنگ غنچے، لہو بھرے ہیں، ہمارے لب کو کھلا نہ ہرگز (تھو شاہ کلیم)

لوٹتا ہوں میں کبھی خاک پہ بن کر صوفی
وہ جو مجلس میں ہوا نغمہ سرا میں ہی ہوں (مولوی احمد بخش یکدل چشتی)

یہ تمنا ہے مری حضرت شبیر سے آج
کہ تجھے تختِ شہادت پہ ہو سر سبز یہ تاج (فقیر نورالدین منور)

جہاں کو کیوں نہ کرے نور عدل سے تسخیر
کہ آسمان جلالت کا ہے تو مہر منیر (دینا ناتھ سوز)

ڈاکٹر ممتاز گوہر نے پنجاب کے چھوٹے چھوٹے غیر معروف مقامات سے بھی اردو سے پنجابیوں کی تخلیقی محبت کے نقوش ثابت کیے ہیں۔ چنانچہ عبدالرحمٰن خلدی کا تعلق وڈالہ سندھواں (سیالکوٹ) سے تھا۔ نصرت اللہ پارسا کا بٹالہ سے، احمد یار مرالوی کا سوہدرہ سے اور عزیزالدین اشرف نوشاہی کا پاکپڈو کے سے تھا، رنجیت سنگھ کے عہد میں مولوی فریدالدین، فیض بخش فیض، غلام حسین خرم کے سائے میں جو ادیب پرورش پا رہے تھے انہیں شاعری کے علاوہ نثر میں شہرت حاصل ہوئی۔ ان میں نمایاں نام مولوی نور احمد چشتی، مفتی غلام سرور لاہوری، دیوان امرناتھ اکبری، مولوی پارس علی، مولوی نُور دل چشتی، احمد حسین خان، انور حسین ہما، امین چند کے نام اہم ہیں۔ ان ادبا میں شاعری کے علاوہ تاریخ نگاری کا رجحان روز افزوں تھا۔ ان میں مفتی غلام سرور کی "تاریخ مخزن

پنجاب''......مولوی نور احمد چشتی کی دو کتابیں ''تحقیقات چشتی'' اور ''یادگار چشتی'' ۔امین چند کا ''سفرنامہ پنجاب'' اور مفتی تاج الدین کی کتاب ''حالات ضلع لاہور'' اردو کے تاریخی ادب کا سرمایہ ہیں اور یہ تاریخ نگاری میں اہل پنجاب کے ذوق وشوق کی مظہر بھی ہیں۔ اس دور میں عیسائی مشنریوں نے اپنی تبلیغی سرگرمیوں کو نہ صرف وسعت دے دی تھی بلکہ مسلمانوں کی مذہبی جذبات کو مجروح کرنا اور ان کی دینی غیرت کو للکارنا بھی شروع کر دیا تھا۔انگریز مشنریوں سے کہیں زیادہ مقامی پادری مسلمانوں کی دل آزاری میں پیش پیش تھے۔پادری رام چندر پٹیالوی، پادری ٹھاکر داس، پادری طالب الدین اور پادری عمادالدین چونکہ اخبارات میں مضمون بھی لکھتے تھے اور مذہبی موضوعات کے علاوہ ادبی، معاشرتی اور ملکی موضوعات پر بھی قلم اٹھاتے تھے، اس لیے پنجاب کے مسلمان مصنفین نے ان کا مقابلہ عالمانہ شان سے کیا۔مولانا الطاف حسین حالی نے پادری عمادالدین کی دل آزار کتابوں ''تاریخ محمدی'' اور ''تحقیق الایمان'' کا جواب لکھا۔ڈاکٹر ممتاز گوہر لکھتی ہیں:

''رد نصاریٰ کی کوششوں میں سرزمین پنجاب کے تمام علماء سرگرم نظر آتے ہیں لیکن جن چند ہستیوں کو مذہبی مناظروں کی تاریخ فراموش نہیں کر سکتی ان میں حافظ ولی اللہ لاہوری، مولانا الطاف حسین حالی پانی پتی، مولانا فقیر محمد جہلمی، مولانا فیروزالدین ڈسکوی اور مولانا فتح محمد قصوری کے نام قابل ذکر ہیں۔''[۴۸]

مولانا حالی کا نام آیا ہے تو یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ ۱۸۵۷ء میں سقوط دہلی کے بعد اردو کی ترویج وترقی کا اہم ترین مرکز پنجاب کا دارالحکومت لاہور بن گیا تھا۔چنانچہ اردو زبان وادب کی وہ شمع جس نے قرون اولیٰ میں شمال سے جنوب کی طرف سفر کیا تھا اور ولی دکنی کے زمانے میں جنوب سے شمال کی طرف مراجعت کی تھی اب لاہور کی طرف روانہ ہو چکی تھی اور شمع برداروں کے اس قافلے میں مولوی کریم الدین احمد، پنڈت من پھول، مولوی سید احمد دہلوی، الطاف حسین حالی، پیارے لال آشوب، درگا پرشاد نادر، اور محمد حسین آزاد جیسا دبا شامل تھے۔[۴۹] اور غزل کی مقبولیت کے دور میں اردو نظم کی ترویج اور شاعری کے چند محدود موضوعات سے نکالنے کے لیے انجمن پنجاب کے زیر اہتمام نہ صرف نئی طرز کے یک موضوعی نظم کے مشاعروں کا آغاز کیا گیا بلکہ ہفتہ وار لیکچروں کا ایک سلسلہ بھی شروع ہوا، ایک کتب خانہ قائم کیا گیا اور نئے تصورات کے مقالات کی اشاعت کے لیے ''رسالہ انجمن پنجاب'' جاری کیا گیا۔انجمن پنجاب کی مختلف قسم کی سرگرمیوں نے جو اثرات مرتب کیے اور پنجاب کو سربلند کر دیا اس کا تذکرہ ڈاکٹر صفیہ بانو نے ان الفاظ میں کیا ہے:

''برصغیر پاک وہند میں بہت سی تحریکیں اٹھیں اور وقت کے ساتھ ختم ہو گئیں لیکن انجمن پنجاب ایک ایسی ہمہ جہت اور فعال تحریک تھی کہ اس کے باقیات الصالحات آج بھی اورینٹل کالج، پبلک لائبریری، عجائب گھر اور خود پنجاب کی تہذیب اس کی نشان دہی کرتی ہے۔''[۵۰]

مولانا حالی نے لاہور میں قیام کے دوران اردو تنقید اور شاعری کے جو تصورات قبول کیے ان کو پروان علی گڑھ نے چڑھایا اور یہ حقیقت باعث افتخار ہے کہ حالی کے ذہنی ارتقاء میں پنجاب نے اہم کردار ادا کیا ہے اور مولانا محمد حسین آزاد کی طبع تجدد پسند کی آبیاری لاہور ہی نے کی۔آزاد نے اس سرزمین پر مستقل قیام کیا۔پنجاب کی ثقافتی توانائی اور رعنائی کو قبول کیا اور اردو زبان وادب کو اپنے تخلیقی، تحقیقی اور تنقیدی جواہر سے ثروت مند کر دیا۔بلاشبہ انجمن پنجاب کی ادبی خدمات میں پنجاب کے ناظم تعلیمات میجر ہالرائڈ

کی توجہ اور تجدد پسندی کا عمل دخل بہت زیادہ تھا اور انہوں نے موضوعی مشاعروں اور تجزیاتی مقالہ نگاری کی سرپرستی کی لیکن ان کے منصوبوں کو مولانا حالی اور آزاد نے پروان چڑھایا۔ چنانچہ اردو شاعری کے پہلے مشاعرے کے تعارفی جلسے میں مولانا آزاد نے نئی شاعری کے اس انقلاب آفریں منشور کا اعلان کیا جو اردو شاعری کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے اور جس کا ذکر فرانس کے مستشرق گارساں دتاسی نے اپنے خطبے میں کیا ہے [۱۹]۔ اس مشاعرے میں پنجاب نے دہلی کے ٹوٹے ہوئے ستاروں کو جن میں حالی، آزاد، اور مرزا ارشد گورگانوی کے علاوہ میر نثار علی شہرت، مولوی سیف الحق ادیب، فتح الدین بسمل، میر ناظم حسین ناظم، امو جان ولی اور گوری شنکر مجذوب جیسے شعرا و ادیب شامل تھے اس خطے کے لوگوں سے ملاقات اور تبادلہ خیال کے لیے منظم فراہم کر دیا۔ ان مقامی اصحاب میں مفتی غلام سرور، مرزا اعظم بیگ، منشی نظام الدین، شیو ناتھ خنظر، سردار دھیان سنگھ، میراں صاحب نامی، لالہ پرسکھ رائے، منشی کنہیا لال اور سردار دیال سنگھ مجیٹھیہ جیسے لوگ شامل تھے جن کی ادبی سرگرمیوں کو انجمن پنجاب نے فروغ دیا اور لاہور کو بھی ایک دبستان ادب بنا دیا۔ یہاں انجمن اتحاد کا ذکر بھی ضروری ہے جو ''خوں بہا'' کے مصنف حکیم احمد شجاع کے والد نے قائم کی تھی اور جس کی ادبی محفلیں بازار حکیماں اندرون بھاٹی دروازہ میں ہوتی تھیں۔ ان محفلوں میں شیخ عبدالقادر، علامہ اقبال، سر شہاب الدین، خواجہ رحیم بخش، خواجہ کریم بخش، مولوی احمد دین، مفتی عبداللہ ٹونکی اور شیخ گلاب دین کے علاوہ متعدد شرفائے شہر شریک ہوتے تھے۔ علامہ اقبال اپنا کلام جب تک ان محفلوں میں سنا نہ لیتے کسی اور مجلس عام میں پڑھتے نہ تھے۔ ان مجالس نے نوجوان ادیبوں اور شاعروں کی تربیت میں گراں قدر حصہ لیا [۲۰]۔ حکیم امین الدین سرکاری وکیل مقرر ہو کر لاہور سے باہر چلے گئے تو یہ محفلیں لٹی لاج میں منعقد ہونے لگیں جن میں مولانا ظفر علی خان، مولوی انشاء اللہ خان، مدیر اخبار ''وطن''۔ بابو وہاب الدین جو اس دور کے ادب میں ابھر رہے تھے شرکت کرتے تھے [۲۱]۔ پنجاب میں اردو کے فروغ و ارتقا میں لٹی لاج کی علمی و ادبی محفلوں کی افادیت سے انکار ممکن نہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ انیسویں صدی کے نصف اول میں لکھنؤ اور دلی کو اردو کی مستند ٹکسالوں کا درجہ حاصل تھا تاہم اس عرصے میں لاہور کو بھی ادبی حیثیت مل چکی تھی اور انیسویں صدی کے وسط میں دلی کالج منتشر ہوا تو اس کے بکھرے ہوئے شیرازے کو لاہور نے اپنے دامن میں لے لیا۔ اس شہر سے نظم جدید اور تنقید جدید کی تحریکیں محمد حسین آزاد اور الطاف حسین نے برپا کیں اور یہ تحریکیں اس لیے بہت جلد بارور ہونے لگیں کیونکہ لاہور کی زمین بڑی زرخیز تھی اور یہ نئے تصورات کو قبول کرنے میں تاخیر نہیں کرتی تھی۔ بیسویں صدی میں لاہور سے رسالہ ''مخزن'' کا اجرا بھی اس نوع کا ایک اجتہادی کارنامہ تھا جس کے مدیر شیخ عبدالقادر فکر و خیال کی نئی لہروں کو پہچانتے تھے اور جوہر قابل کے قدر دان تھے۔ ''مخزن'' کے صفحات سے اقبال، ظفر علی خان، تلوک چند محروم، حفیظ جالندھری، خوشی محمد ناظر، غلام بھیک نیرنگ اور متعدد پنجابی ادبا نمایاں ہوئے جن کے گھر کی زبان پنجابی تھی لیکن جو تخلیق کاری کے لیے اردو زبان سے رشتۂ محبت استوار کر چکے تھے۔ ان ادبا نے اردو زبان و ادب کی ہیئت اجتماعیہ کو نئے طریقوں سے استوار کیا اور پورے ملک کے ادب پر دوررس اثرات مرتب کیے۔

بیسویں صدی کے نصف اول میں پنجاب کے ادیبوں نے اردو ادب اور زبان کو متعدد زاویوں سے متاثر کیا۔ ان بالواسطہ اور بلاواسطہ اثرات کی وجہ سے اسے فروغ اردو کا زریں دور قرار دیا جا سکتا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ اس دور میں حافظ محمود شیرانی نے شمال مغرب سے آنے والے حملہ آوروں کی اس گزرگاہ کو جس پر اب انگریزی راج قائم ہو چکا تھا لسانی تحقیقات کے بنیادی اصولوں

کی اساس پر پنجابی سے اردو کے امٹ رشتے کا اثبات کیا۔اس دور میں علامہ اقبال اردو شاعری میں تجدد کا آفتاب بن کر ابھرے۔ اقبال پنجابی نژاد تھے لیکن انہوں نے اپنی تخلیقی زبان کا خمیر مسلمانوں کی شوکت رفتہ سے وضع کیا۔ان کی زبان نے برصغیر کے لسانی تنازع میں بے حد موثر کردار ادا کیا اور بالآخر مسلمانوں کو پاکستان حاصل کرنے میں مدد دی۔میر اور غالب کے بعد اقبال اردو کا وہ عظیم شاعر ہے جس نے اپنی تخلیقی فعالیت سے برصغیر کے پورے مطلع ادب کو منور کیا اور بیسویں صدی ان کے نام منسوب کر دی گئی۔ گویا بیسویں صدی کے ابتدائی اڑتیس برسوں میں اقبال نے جو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے، لاہور میں پروان چڑھے، پوری دنیا کو فتح کر لیا تھا۔اور اب اکیسویں صدی میں بھی اقبال لاہوری کا پرچم لہرا رہا ہے اور آسمان کو چھو رہا ہے۔

اقبال کی نظم نگاری کی جہت ان کے اپنے باطن سے پیدا ہوئی، اس کے بیج کو پنجاب کی زرخیز مٹی نے پروان چڑھایا اور انہوں نے غزل کے داخل کو موضوعاتی تنوع اور نئی لفظیات سے تغیر آشنا کیا، تاہم دلچسپ بات یہ ہے کہ مرور ایام کے ساتھ اب تصدق حسین خالد، عطا اللہ سجاد، میرا جی، ن م راشد اور فیض احمد فیض جیسے شاعروں کا ظہور پنجاب سے ہو چکا تھا۔ان کے پہلو بہ پہلو ترقی پسند تحریک کا سیاسی پیغام بھی اس خطے میں پہنچ چکا تھا۔چنانچہ بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں جب دوسری جنگ عظیم پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی، لاہور میں ادب کی دو بڑی تحریکیں سرگرم عمل تھیں۔ایک ترقی پسند تحریک اور دوسری حلقہ ارباب ذوق کی تحریک۔اول الذکر کا ادبی عمل خارجی حقیقت کی صداقت پسندانہ پیشکش سے عبارت تھا۔جبکہ مؤخرالذکر خارج کے مشاہدے کو شاعر کے داخلی ردعمل کے اثرات قبول کرنے کا موقع دیتی اور شاعری میں باطن کے منطقوں کی سیاحت کراتی۔ترقی پسند تحریک کا بیج سجاد ظہیر لندن سے لائے تھے اور وہ ادب کے ذریعے سرخ انقلاب لانے کے داعی تھے۔حلقہ ارباب ذوق کے ادبا نے انگریزی ادب کے مطالعے کے اثرات قبول کیے لیکن اپنی تحریک کا تارو پود پنجاب کی سرزمین سے ابھارا اور انسان کی انفرادیت اور داخلیت کے تاثر کو تخلیقی جہت دی تو اردو نظم کی کایا پلٹ دی۔اس دور میں پنجاب سے جن شعرا کو اعلیٰ ادب نے قبولیت کا تاج زرنگار پہنایا ان میں اختر شیرانی، یوسف ظفر، ضیا جالندھری، مجید امجد، قیوم نظر، مخمور جالندھری، تخت سنگھ اور راجہ مہدی علی خان کے نام اہم ہیں۔ترقی پسند تحریک نے جن شعرا کو پنجاب سے شہرت عطا کی ان میں ظہیر کاشمیری، عارف عبدالمتین، قتیل شفائی، احمد ریاض اور احمد ندیم قاسمی کو شمار کیا جا سکتا ہے۔ فیض احمد فیض کا منفرد اعزاز یہ ہے کہ انہیں اقبال کے بعد بیسویں صدی کا سب سے بڑا شاعر تسلیم کیا گیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی مستعار ترقی پسندی پر پنجاب کی تجدد پسندی اور تخلیقی تازگی و رعنائیت کے زاویے حاوی ہیں اور وہ ترقی پسند نظریے کی تقلید پنجاب کے دوسرے ترقی پسندوں کی طرح اندھا دھند نہیں کرتے تھے۔

منشی پریم چند، سجاد حیدر یلدرم اور راشد الخیری اردو افسانے کے پیش رو ہیں اور ان میں سے کسی کا تعلق بھی پنجاب سے نہیں۔لیکن یہ حقیقت نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ ان تینوں کا ابتدائی تعارف لاہور کے رسالہ ''مخزن'' نے کرایا تھا۔مخزن کی عطا یہ بھی ہے کہ اس کے تجدد پسند مدیر شیخ عبدالقادر نے مختصر افسانے کے فن کو پروان چڑھانے کے لیے دوسری زبانوں کے شاہکار افسانوں کے تراجم اردو میں پیش کیے جو نئے افسانہ نگاروں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوئے۔اس دور میں پنجاب سے جو ترجمہ نگار نمایاں ہوئے ان میں منصور احمد، حامد علی خان، صلاح الدین احمد، تیرتھ رام فیروزپوری، ظفر علی خان، عبدالمجید سالک، راجہ مہدی علی خان اور غلام رسول مہر کے نام اہم ہیں۔مختصر افسانے کے فروغ میں مجنوں گورکھپوری، عصمت چغتائی، ل، احمد، علی

عباس حسینی، ابوالفضل صدیقی، اختر اورینوی اور سہیل عظیم آبادی نے پورے ہندوستان میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ تاہم اردو افسانے کے زرّیں دور کی کہکشاں پنجاب میں مرتب ہوئی اور مختصر اردو افسانے کو جدیدیت کے راستے پر پنجاب نے ہی ڈالا اور اس سرزمین سے سعادت حسن منٹو، ممتاز مفتی، کرشن چندر، غلام عباس، راجندر سنگھ بیدی، قدرت اللہ شہاب، اوپندر ناتھ اشک، فیاض محمود، احمد ندیم قاسمی، مہندر ناتھ، سرلا دیوی، اور بلونت سنگھ جیسے افسانہ نگار نمایاں ہوئے جنھیں بجا طور پر اردو افسانے کے تابناک ستاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔

مرزا غالب سے پہلے طنز و مزاح پر تضحیک اور ہجو سے دوسروں کو نشانۂ تمسخر بنانے کی روش عام تھی، غالب نے زندگی کے غم آمیز ماحول پر فطری خوش مزاجی سے غالب آنے کی کاوش کی اور مزاح کو وہ رفعت عطا کی جس میں زہرہا کی لطافت کو روپ اختیار کر لیتی ہے۔ سقوطِ دہلی کے بعد "اودھ پنچ" کا دور شروع ہوا تو رتن ناتھ سرشار، سجاد حسین، مچھو بیگ ستم ظریف، احمد علی شوق، اور جوالا پرشاد برق جیسے مزاح نگار پیدا ہوئے جنھوں نے معاشرے کے بدلے ہوئے حالات اور شخصیات کو تلخ ترین طنز کا نشانہ بنایا، مغربی تہذیب کا خاکہ اڑایا۔ اور طعن و تشنیع سے غیر معمولی کام لے کر مسکراہٹوں کی بجائے قہقہہ بیدار کرنے کی کاوش کی۔ اس دور میں اکبر الٰہ آبادی نے رعایتِ لفظی، تحریف اور انگریزی الفاظ کے ظریفانہ استعمال سے شکست خوردہ معاشرے کو خود اپنی حالت پر مسکرانے اور اصلاح کی طرف قدم بڑھانے کا حوصلہ دیا۔ انیسویں صدی کے ربع آخر میں طنز و مزاح کے یہ تمام حربے پنجاب کے شاعروں اور نثر نگاروں نے بھی استعمال کیے۔ لیکن بیسویں صدی میں جب انگریزی ادب کے مطالعے کو فروغ حاصل ہوا اور "مخزن"، "کہکشاں" اور "خیالستان" کے علاوہ "ہمایوں"، "ادبی دنیا"، "شاہکار"، "نیرنگ خیال"، "فردوس" اور "داستان" جیسے رسائل چھپنے لگے تو اہل پنجاب نے پھبتی، ضلع جگت، تضحیک، اور استہزا سے گریز کی روش اختیار کی اور پنجاب کے مزاح نگاروں نے حالات زمانہ، تہذیب و تمدن اور شخصی افعال کو بانداز دگر دیکھنے کی کوشش کی اور زندگی کی یکسانیت میں مسکراہٹوں سے تحرک پیدا کر دیا۔ ہنگامی مسائل اور سیاسی حالات پر ظفر علی خان نے ارتجالی اور بے ساختہ سیاسی طنز کی طرح ڈالی اور غلام قوم کو مسکرانے کے بے شمار مواقع فراہم کر دیے۔

پیچ گاندھی کی لنگوٹی کا چلے تھے کھولنے
کشمکش میں اپنی بھی پتلون ڈھیلی ہو گئی

دلچسپ بات یہ ہے کہ اس دور میں اقبال جیسے بلند نظر شاعر نے بھی اکبر الٰہ آبادی کے اسلوب میں ظرافت اختیار کی لیکن خوبی یہ کہ انہوں نے ظریفانہ شاعری سے تیر اندازی کا کام لیا اور سوئی ہوئی قوم کے احساس کو نئی کروٹ دینے کی سعی کی۔

دیکھیے چلتی ہے مشرق کی تجارت کب تک   شیشۂ دیں کے عوض جام و سبو لیتا ہے
ہے مداوائے جنوں نشترِ تعلیم جدید   میرا سرجن رگِ ملت سے لہو لیتا ہے

آزدی سے قبل پنجاب کے مزاح نگاروں نے زندگی کی ناہمواریوں کو طنز و مزاح کا موضوع بنایا اور نثر اور شاعری کی اصناف کو افراط سے استعمال کیا۔ پطرس بخاری، کنہیا لال کپور، ضمیر جعفری، عبدالمجید سالک، حاجی لق لق، راجہ مہدی علی خان، خضر تمیمی، عبدالعزیز فلک پیما، کرشن چندر اور چراغ حسن حسرت پنجاب کے چند ایسے مزاح نگار ہیں جنھوں نے اس خطے کی کھلی اور کشادہ فضا سے وافر مقدار میں آکسیجن جمع کی اور اس فطری قوت کو مسکراہٹیں بیدار کرنے اور ذہنی تشنج دور کرنے کے لیے تخلیقی سطح پر

استعمال کیا۔

انجمن پنجاب نے انیسویں صدی کے ربع آخر میں محمد حسین آزاد کی سرپرستی میں تحقیق وتنقید کی جس روایت کوفروغ دیا تھا اس کا ایک کامیاب نمونہ الطاف حسین حالی کے مقدمہ شعروشاعری کی صورت میں سامنے آیا۔خوشی کی بات یہ ہے کہ حالی کے تنقیدی تجزیے کو پورے ہندوستان میں استحسان کی نظر سے دیکھا گیا۔مجھے حیرت اس بات پر بھی ہے کہ امداد امام اثر کی کتاب ''کاشف الحقائق'' جو بیک وقت تذکرہ بھی ہے اور شاعری کی بوطیقا بھی لیکن یہ حالی پانی پتی کے ''مقدمہ شعروشاعری'' پر بھی فوقیت حاصل نہیں کرسکی جواب تک نظریاتی تنقید کی پہلی وقیع ترین کتاب شمار ہوتی ہے۔پنجاب میں اورینٹل کالج لاہور کا قیام اس صوبے کی تعلیمی، تہذیبی اور تمدنی زندگی کا ایک اہم ترین واقعہ ہے۔اس کالج سے حافظ محمود شیرانی نے تحقیق کی ایک نئی روایت کولسانی خطوط پر استوار کیا۔اس روایت کوتقویت دینے والوں میں مولوی محمد شفیع، مولوی محمد اقبال، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر عبدالشکور احسن اور ڈاکٹر محمد باقر کے نام نمایاں ہیں۔اس دور میں ہی پنجاب نے ڈاکٹر تاثیر، حمید احمد خان، مولانا صلاح الدین احمد، عابد علی عابد، ڈاکٹر محمد صادق، حزب اللہ، وجیہ الدین احمد اور علم الدین سالک جیسے نقاد اور محققین پیدا کیے جو ادب کی تفتیش کا فریضہ انجام دینے کی بجائے صداقت کی تلاش میں دلچسپی لیتے تھے۔چنانچہ اس دور میں نہ صرف ماضی کے نادر خزینوں کی دریافت عمل میں آئی بلکہ ناقدین نے فن پارے کے داخل میں چھپی ہوئی حقیقت اور حسن کو دریافت کرنے کی سعی بھی کی۔یہاں ن۔م۔ راشد اور میراجی کا ذکر خاص طور پر ضروری ہے جنہوں نے نظم جدید کے تجزیوں کا آغاز کیا اور تخلیق کے باطن سے شاعر کو دریافت کرنے کی طرح ڈالی۔اس دور میں اس قسم کے تجزیاتی مطالعے رسالہ ''ادبی دنیا'' کے سوا ملک کے کسی اور حصے سے چھپنے والے رسائل میں نظر نہیں آتے۔

اردو زبان کے آغاز کی بحث سے لے کر ۱۹۴۷ء میں آزادی تک کے اردو ادب اور پنجاب کے ادیبوں کی مثبت اور کثیر عطا اور پورے ملک کے ادب پر ان ادیبوں کی تخلیقات کے اثرات کا یہ ایک اجمالی جائزہ ہے جس کے متعدد زاویے مجھے تشنۂ اظہار محسوس ہوتے ہیں۔تاہم یہ اعتراف ضروری ہے کہ اردو زبان کے فروغ، ارتقاء اور وسعت میں متعدد مقامی زبانوں کے علاوہ چند غیر ملکی زبانوں بالخصوص انگریزی نے بھی حصہ لیا۔اس زبان کے ادب کی تخلیق کاری میں غیر مسلم ادیبوں کی شرکت بھی غیر معمولی ہے۔اس دور میں اردو کو ہندی کے قریب لانے کی کوشش کی گئی تو دوسری طرف ہندی اردو تنازع نے سیاسی صورت بھی اختیار کی لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ہندی زبان کی مخالفت اور انگریزی زبان کی بالادستی کے باوجود اردو زبان کو برِ ہند کی سب سے زیادہ بولی اور سمجھی جانے والی زبان کا درجہ حاصل رہا اور آزادی کے بعد جب اس کے داخلی مزاج کا تجزیہ ڈاکٹر وحید قریشی نے کیا تو انہوں نے لکھا:

> ''اردو کا لسانی پیکر ہند آریائی تھا۔لیکن اس کا ذخیرۂ الفاظ کچھ اس طرح عربی اور فارسی سے مربوط تھا کہ اردو کی عام فضا اسلامی رنگ لیے ہوئے تھی۔''[۴۲]

علامہ اقبال اور پنجاب کے شعرا میں سے امین حزیں، حفیظ جالندھری، اثر صہبائی، اسد ملتانی، منظور احمد منظور نے اس زبان کے اسلامی رنگ کو پختہ کرنے میں بالخصوص معاونت کی۔اس زبان کا نستعلیق رسم الخط دائیں سے بائیں لکھا جاتا ہے اور یہ فارسی اور عربی کے مماثل ہے۔چنانچہ جب تحریک پاکستان کو فروغ حاصل ہوا تو قائداعظم محمد علی جناح نے اردو کی اس حیثیت ہی کو قبول کیا

اور اسے نئی آزاد مسلم ریاست کی قومی زبان کے طور پر تسلیم کرنے میں تامل نہ کیا۔ [۴۵]

آزادی کے بعد اردو زبان کو قومی حیثیت ملنے کی وجہ سے اس کا سماجی مرتبہ بلند ہو گیا اور پاکستان میں وہ آویزش بھی ختم ہو گئی جو سر سید کے عہد میں ہندی کے ساتھ شروع ہوئی تھی۔ لیکن یہ زبان نئے وطن میں داخل ہوئی تو پنجاب کی یہ بیٹی بیوہ ہو چکی تھی۔ لیکن اس کا لسانی خطہ کراچی قرار دے دیا گیا۔ اس دور میں پنجاب نے اپنے قومی فرض کو پہچاننے میں کسی تساہل سے کام نہ لیا اور اپنے ہی دلیس کی اس بیوہ کو چادر اور چار دیواری کا تحفظ فراہم کرنے کے بعد اس کی قومی حیثیت کو مستحکم کرنے کی عملی کاوش شروع کر دی۔ [۴۶] اب اردو زبان کو قومی یک جہتی، صوبائی ہم آہنگی اور باہمی اشتراک پیدا کرنے کا فریضہ تفویض ہو گیا لیکن پاکستان کو اب بھی انگریزی زبان کے ایک وسیع خطے میں غلبہ حاصل تھا۔ انگریزی زبان پر دسترس رکھنے والا حکمران طبقہ لارڈ میکالے کی حکمت عملی کو نافذ کر رہا تھا اور انگریزوں سے زیادہ انگریز تھا۔ چنانچہ آزادی کے بعد اردو زبان کو جن مسائل سے نبرد آزما ہونا پڑا، ان میں اہم مسئلہ قومی سطح پر اس زبان کا نفاذ تھا۔ اس دور میں اردو کی پہلی تحریک جو لاہور سے شروع ہوئی وہ "اردو بولو" تحریک تھی اور اس کا بڑا مقصد اردو کو عوام کی زبان بنانا تھا۔ اس تحریک کے روح رواں مولانا صلاح الدین احمد تھے جو پنجابی نژاد تھے اور لاہور سے اردو کا مقبول ترین رسالہ "ادبی دنیا" شائع کرتے تھے۔ انہوں نے مشرقی اور مغربی پاکستان میں سیاست کے دو مختلف روپ پروان چڑھتے اور زبان کو سیاسی مقاصد کے حصول کا وسیلہ بنانے والوں کے سامنے "اعلائے کلمۃ الاردو" کیا:

> "اردو کو صحیح معنوں میں قومی زبان بنانے کا جو عظیم الشان کام اس نئی مملکت کے سامنے موجود ہے وہ اہل اقتدار کی بے نیازی اور مجرمانہ غفلت کے باوجود فرزندان پنجاب ہی کے ہاتھوں تکمیل پذیر ہوگا۔" [۴۷]

پنجاب سے اردو زبان کے ایک اور قافلہ سالار ڈاکٹر سید عبداللہ نے ثابت کیا کہ اس مرکب زبان میں استفادہ اور ارتقا اور جذب و قبول کی صلاحیتیں دوسری ترقی یافتہ زبانوں کی صلاحیتوں سے مطابقت رکھتی ہیں اور اس زبان کے شعری اور نثری ادب کا ارتقا جو ایک مسلسل عمل ہے جو روز افزوں ہے۔ انہوں نے "انسامن" میں عملی اردو کا ایک اہم مرکز قائم کیا۔ سائنسی علوم کے متعدد لیکچر اردو میں کرائے، مختلف اہم مقامات پر اردو کانفرنسیں کیں اور مغربی پاکستان اردو اکیڈمی قائم کی جو علوم جدیدہ کی کتابیں اردو میں چھاپ رہی ہے۔ ان کی وفات کے بعد اس اکیڈمی کا کام رکنے نہیں پایا اور اب اس کی نظامت ڈاکٹر وحید قریشی کر رہے ہیں جو استادالاساتذہ ہیں اور سینکڑوں طالب علموں کو اردو کی تدریس و تعلیم میں شامل کر چکے ہیں۔

اردو، پنجاب کے صحیح الفکر دانشوروں کے مزاج کا حصہ اور ان کی قومی امنگوں کی تکمیل کی زبان تھی۔ پنجاب کے ایک اور فرزند عظیم حمید احمد خان نے جو خانوادہ ظفر علی خان کے فرد فرید اور پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہ چکے تھے، نفاذ اردو کے سلسلے میں اس زبان کی علمی، فکری اور تہذیبی حیثیت کو اجاگر کیا اور اس کے چار زاویے ابھارے:

اول: "ہم ایک نوزائیدہ ملک ہیں۔ اس لیے ہم پر لازم ہے کہ اپنی ملکی زبان کو سیاست اور ملک کے کاروبار میں وہ جگہ دیں جس سے وہ اب تک محروم ہے۔"

دوم: "ہم ایک قدیم ملت ہیں۔ اس لیے لازم ہے کہ اپنی ملی زبان سے وہ صحیح تعلق پیدا کریں جس کے بغیر ہم اپنی جماعتی

ہیئت کی بنیادوں سے بے خبر رہتے ہیں۔"

سوم: "ہم ایک عظیم الشان تہذیب کے وارث ہیں۔ اگر ہم اپنی تہذیبی زبان سے مناسب رابطہ نہ قائم رکھیں تو ہم اپنی تہذیبی روایات سے خود بخود کٹ جاتے ہیں۔"

چہارم: "ہم ایک ترقی پسند مملکت ہیں جسے شب و روز اپنے مستقبل کی تعمیر سے سروکار ہے۔ اس کے لیے ایک ایسی زندہ زبان کی ضرورت ہے جو ہمارے لیے اب اور آگے چل کر ضروری علوم و فنون کی ترجمان بنے۔" [8]

قومی زبان اردو کے خلاف محاذ آرائی جب سیاسی انداز میں شروع کر دی گئی تو اس کے خلاف بھی موثر صدا پنجاب سے ہی ابھری اور قومی یک جہتی کے لیے حمید احمد خان نے کہا:

> "قومی زبان کوئی بیکار کا کھلونا نہیں ہے کہ جی چاہا تو اٹھا کر باہر پھینک دیا۔ یہ اجتماعی زندگی کی ایک بنیادی ضرورت ہے۔ جس کو پورا کیے بغیر معاشرے کی تعمیر و تشکیل نہیں ہوتی۔ قومی وحدت کی تعمیر کے لیے افراد کا قوم ہونا اور ہم خیال ہونا ضروری ہے۔ اور ہم خیال ہونے کے لیے ہم زبان ہونا اہمیت رکھتا ہے۔ یقین جانیے کہ زبان کا فرق دلوں کا فرق پیدا کرتا ہے لیکن ہم زبانی ہم دلی کی پہلی شرط بن جاتی ہے۔" [9]

نفاذ اردو کے لیے ایک مؤثر تدبیر کاری کی ضرورت ہے۔ سرکاری حلقے اس زبان سے مجرمانہ غفلت برت رہے تھے۔ سیاسی طبقے مقامی زبانوں کو ہوا دے رہے تھے۔ اس صورت حال میں اب نفاذ اردو کے ساتھ بقائے اردو کا سوال بھی پیدا ہو چکا تھا۔ اس سلسلے میں جو علمی، ادبی اور لسانی جنگ لڑی گئی اس کے بیشتر دفاعی مورچے پنجاب میں قائم ہوئے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے اس کا مطالعہ مسلمانوں کے ماضی کے پس منظر میں کیا اور یہ نتیجہ اخذ کیا:

> "اسلام نے مختلف ملکوں کی زبانوں کو برقرار رکھا لیکن اسے اسلامی معاشرے کے بنیادی رجحانات سے متصادم ہونے سے روکا۔" [10]

انہوں نے قومی ضرورتوں کے لیے اردو کی نئی تشکیل کا حوالہ بھی دیا اور لکھا:

> "اردو میں قومی، بین العلاقائی، اور رابطے کی زبان رہنے کی پوری صلاحیت ہے۔ لیکن وہ اردو دہلی اور لکھنو کی نہیں ہوگی۔ پاکستان کی اردو ہوگی اور اسے مقامی روزمرے، مقامی محاورے، مقامی تذکیر و تانیث اور مقامی معاشرتی زندگی کا عکاس ہونا پڑے گا۔"

خوشی کی بات یہ ہے کہ انگریزی دان طبقے اور مخصوص مزاج کے سیاست دانوں کی مخالفت کے باوجود اردو زبان کی یہ فطری نشو و نما عمل میں آ رہی ہے۔ اور پاکستان کی اردو بھارت میں بولی جانے والی اردو سے مختلف صورت اختیار کرتی جا رہی ہے۔ بعض اردو اداروں کی رسمی سرپرستی حکومت کرتی ہے اور ملک میں "اکادمی ادبیات پاکستان" اور "مقتدرہ قومی زبان" دو بڑے ادارے بھی موجود ہیں لیکن انگریزی کی بالادستی سے نجات اور اردو کے پورے نفاذ کی صورت نظر نہیں آتی۔ لیکن غنیمت امر یہ ہے کہ علاقائی زبانوں کا اردو زبان سے تصادم کبھی عمل میں نہیں آیا۔ اور دوسری طرف علاقائی زبانیں اپنا اپنا ادب پیدا کر رہی ہیں تو اردو زبان میں ایسا ادب پیش کیا جا رہا ہے جسے چاروں صوبوں کا نمائندہ ادب قرار دیا جا سکتا ہے۔ دنیا کے "گلوبل ویلج"

مل جانے کی وجہ سے اردو کا رابطہ عالمی ادب سے بھی ہے۔ چنانچہ اب جو امتزاج عمل میں آ رہا ہے اس میں متعدد علاقائی اور غیر ملکی رنگ بھی شامل ہیں۔

پنجاب میں لفظ کو پیش پا افتادہ انداز میں استعمال کرنے کی بجائے اسے نئے تخلیقی انداز میں قبول کیا گیا۔ اس کے معانی کو کثیرالابعاد بنانے کے لیے علامت نگاری کو فروغ دیا گیا۔ اس عمل میں مقامی زبان اور مقامی تہذیبی رویے سے استفادہ کیا گیا۔ اب جو زبان علمی اور ادبی سطح پر قبول کر لی گئی ہے اور جس میں مزید وسعت پیدا ہو رہی ہے اس کے بیشتر علائم و رموز، تشبیہات، استعارات اور تماثیل میں پنجاب کی علاقائی باس اور اس کی مٹی کی خوشبو موجود ہے۔ اس انداز تخلیق کو پنجاب میں اشفاق احمد، اے حمید، غلام الثقلین نقوی، جمیلہ ہاشمی، بانو قدسیہ، فرخندہ لودھی، محمد منشایاد، یونس جاوید، سرمد صہبائی اور محمد عاصم بٹ نے زیادہ قبول کیا اور اس امتزاج کو افسانے اور ناول میں فطری انداز میں استعمال کیا۔

اصناف سخن میں سے پنجاب کے شعرا نے اردو غزل کی ہیئت کو قائم رکھتے ہوئے اس کے داخل میں پنجابی مزاج سمونے اور نئے الفاظ کی آمیزش سے مقامی مظاہر اور فضا کی عکاسی کی کاوش کی، اس ضمن میں ناصر کاظمی، شہزاد احمد، مجید امجد، ظفر اقبال اور شیر افضل جعفری کے اجتہاد کو تسلیم کیا جا چکا ہے۔ وزیر آغا، منیر نیازی، ریاض مجید، غلام جیلانی اصغر، انور محمود خالد، غلام حسین ساجد، صابر ظفر، تنویر سپرا، جان کاشمیری، شناور اسحاق اور متعدد نئے غزل نگاروں نے گرد و پیش کی پنجابی فضا اور روایات و رسوم کو بالواسطہ طور پر غزل کے پیکر میں سمو کر اس صنف سخن کو ایرانی علائم و رموز سے نجات دلا دی۔ نظم جدید کی تحریک کو میرا جی، راشد، قیوم نظر اور یوسف ظفر نے فروغ دیا۔ آزادی کے بعد مجید امجد، ڈاکٹر وزیر آغا، شہزاد احمد، اعجاز فاروقی، منیر نیازی، جیلانی کامران، آفتاب اقبال شمیم، غلام جیلانی اصغر، شاد امرتسری، انجم رومانی، جمیل ملک اور متعدد دیگر شعرا نے اسے ذاتی تاثرات و احساسات کا آئینہ بنایا اور پروان چڑھایا۔ ان شعرا نے بالعموم علامتی انداز اختیار کیا اور معنی کے زیر سطح مزید نئے معانی سمونے کا انداز اختیار کیا۔ تاہم دلچسپ بات یہ ہے کہ ان جدید شعرا کے پہلو بہ پہلو ترقی پسند سانچے کی نظمیں بھی کثرت سے لکھی جاتی رہیں۔ ظہیر کاشمیری، عارف عبدالمتین، قتیل شفائی، صلاح الدین ندیم اور احمد ندیم قاسمی نے اس نوع کی شاعری کو پنجاب میں زندہ رکھا۔ "فنون" ترقی پسند ادبا کا نمائندہ رسالہ تھا جو احمد ندیم قاسمی کی ادارت میں ان کے سال وفات ۲۰۰۶ء تک چھپتا رہا۔

پنجاب کی شعری روایت میں حمد باری تعالیٰ، نعت نبی اکرم ﷺ اور منقبت صحابہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ عبدالعزیز خالد، حفیظ تائب، حافظ لدھیانوی، نعیم صدیقی، حافظ مظہر الدین، سعید بدر اور متعدد دوسرے شعرا نے نعت نگاری کو نبی اکرم سے اپنے اظہار عقیدت کا وسیلہ بنایا اور حالیؔ، اقبال اور ظفر علی خان نے جو چراغ نعت میں جلائے تھے ان میں اپنی روشنی شامل کر دی۔ آزادی کے بعد ابھرنے والی دو تحریکوں کا مرکز بھی پنجاب ہی تھا۔

اول: افتخار جالب کی نئی لسانی تشکیلات کی تحریک جس کے بیشتر زاویے منفی تھے۔ جیلانی کامران، انیس ناگی، اختر احسن، ظفر اقبال اور عباس اطہر نے اس کے اثرات قبول کیے لیکن اسے ادبی معاشرے نے مسترد کیا۔

دوم: اردو افسانے میں علامت و تجرید نگاری کی تحریک جس پر الزام لگایا گیا کہ اس نے افسانے سے قاری کو خارج کر دیا

اور افسانہ صرف تخلیق کار کے داخل کی آواز بن گیا ہے۔ جس کا مفہوم قاری پر نہیں کھلتا۔ اس تحریک کے خلاف ردِعمل بھی پنجاب سے ہی پیدا ہوا۔ اور نئے افسانے نے معاشرتی حقیقت کی پیشکش کا منصب پھر سنبھال لیا تو علامت کی وسعت سے بھی استفادہ کیا۔ افسانے کے ٹوٹے ہوئے فریم میں کہانی کی صورت واقعہ کو دوبارہ سجانے کا فریضہ بھی پنجاب کے افسانہ نگاروں مثلاً رشید امجد، مشتاق قمر، منشا یاد، غلام الثقلین نقوی، سلیم آغا قزلباش اور طارق محمود نے ادا کیا۔

یہاں مجھے اردو انشائیہ کی نشاۃ ثانیہ کا ذکر بھی کرنا ہے۔ جس کو سر سید احمد خان نے لندن میں سپیکٹیٹر اور ٹیٹلر جیسے انگریزی رسائل میں ایڈیسن اور سٹیل کے "ایسیز" کی صورت میں دیکھا تو اپنے رسالہ "تہذیب الاخلاق" میں فروغ دینے کی کاوش کی۔ آزادی کے بعد انشائیہ کے جدید فروغ میں ڈاکٹر وزیر آغا کی خدمات سب سے زیادہ ہیں۔ انہوں نے انشائیہ کی مثال اپنے خیال پاروں سے پیش کی۔ انشائیہ کے خدوخال اپنی تنقید سے سنوارے، انشائیہ کے حزبِ اختلاف کو کشادہ نظری سے قبول کیا اور انشائیہ کا تخلیقی مزاج سمجھنے اور لکھنے والوں کی ایک جماعت بھی پیدا کی جس میں مشتاق قمر، جمیل آذر، غلام جیلانی اصغر، سلیم آغا قزلباش، اکبر حمیدی، جان کاشمیری، انجم نیازی، حیدر قریشی، ناصر عباس نیر اور متعدد دوسرے لوگ شامل ہیں۔ انشائیہ خالصتاً پنجاب کی پیداوار ہے جو موجودِ زندگی کے مظاہر و اشیا کو نئے زاویوں سے روشناس کراتا اور فرد کو فرحت و بشاشت عطا کرتا ہے۔ نثر کی اصناف میں سے سفرنامہ نگاری، اور یادنگاری کو بھی پنجاب میں فروغِ عام ملا۔ محمود نظامی، اختر ریاض الدین، عطاء الحق قاسمی اور مستنصر حسین تارڑ کے سفرنامے۔ غلام الثقلین نقوی، ابدال بیلا، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر پرویز پروازی، سجاد نقوی، شیخ خالد اور اے کے خالد کی خودنوشت سوانح نگاری اور رابطہ نویسی ان کی یادنگاری کے عمدہ نقوش سامنے لاتے ہیں۔ اردو میں "ہائیکو" جاپان سے درآمد ہوا ہے۔ اس کے درآمد کنندگان میں پنجاب کے ڈاکٹر محمد امین اور ڈاکٹر پرویز پروازی دو اہم نام ہیں۔ لیکن اس بات کا اظہار بھی ضروری ہے کہ ہائیکو کا اولین تعارف ظفر اقبال نے "گل و نہار" میں کرایا تھا۔ اور ہائیکو تراجم کی ایک خوبصورت کتاب عبدالعزیز خالد نے پیش کی تھی جو پنجابی نژاد ہیں۔ حیدر قریشی کی عطا یہ ہے کہ انہوں نے "ماہیا" کو سہ سطری مختصر نظم کے طور پر متعارف کرایا اور اب یہ صنف پورے بھارت میں قبولِ عام حاصل کر چکی ہے۔

تخلیق کے متذکرہ زاویوں کے ساتھ ساتھ فکر و نظر اور تنقید و احتساب کی ایک خاص رو بھی پنجاب میں ہمیشہ موجزن رہی جس کا نقطۂ آغاز محمد حسین آزاد اور الطاف حسین حالی کا مرہونِ منت ہے۔ پنجاب نے نظری تنقید کے ساتھ تجزیاتی عمل کو بھی فوقیت دی، اور ادب کی پرکھ کے لیے نئے پیمانے وضع کیے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر وزیر آغا، ریاض احمد، جیلانی کامران اور مظفر علی سید کی تنقید میں اجتہاد کے عناصر نمایاں ہیں۔ ظہیر کاشمیری، عارف عبدالمتین، عرش صدیقی اور یوسف حسن نے ترقی پسند زاویوں سے ادب کو پرکھنے کی کاوش کی۔ ڈاکٹر وزیر آغا "اردو شاعری کا مزاج" اور "تخلیقی عمل" جیسی کتابیں پیش کرنے کے بعد اب "امتزاجی تنقید" کی تحریک برپا کر رہے ہیں۔ ساختیات، پس ساختیات، مابعد جدیدیت اور تانیثیت جیسے نئے موضوعات کے مشکل مفاہیم کو انہوں نے آسان ترین اور عام فہم انداز میں متعارف کرایا۔ اردو تنقید نے جو نئے نام ابھارے ہیں ان میں پنجاب سے ڈاکٹر انیس ناگی، سراج منیر، ڈاکٹر سہیل احمد خان، ڈاکٹر سعادت سعید، ناصر عباس نیر، ڈاکٹر اے بی

اشرف، ضیاء الحسن، ڈاکٹر روبینہ ترین، ڈاکٹر اعجاز راہی، ڈاکٹر تحسین فراقی، سجاد نقوی، ڈاکٹر انوار احمد کی اہمیت تسلیم کی جا چکی ہے۔ ان کے ہاں نیا سوال اٹھانے اور جواب میں حقیقت کی جستجو کرنے کا رجحان نمایاں ہے۔

یہ تفصیلی بحث اس حقیقت کو آشکار کرتی ہے کہ پانچ دریاؤں کی سرزمین پر پروان چڑھنے والے ادیبوں نے اور عوام نے اردو زبان و ادب کے فروغ میں ہمیشہ سرگرم حصہ لیا۔ پنجابی سے اردو کے رشتہ و پیوند کو قدر کی نگاہ سے دیکھا اور اس میں ادب تخلیق کرنے میں داخلی مسرت محسوس کی۔ آزادی سے پہلے اردو کا تنازع ہندی سے شروع ہوا۔ آزادی کے بعد اسے انگریزی کی فوقیت اور غلبے کا سامنا ہے۔ پنجاب کے ادیبوں نے اور عوام نے اردو زبان کے تشخص کو قائم رکھنے کے لیے جہاد کے اسلامی جذبے سے کام لیا اور مقامی زبانوں اور اردو کے قدیم فطری تعلق اور رشتہ داری کو قائم رکھنے کی کاوش کی۔ پنجاب نے اصناف نظم و نثر میں اعلیٰ پائے کی تخلیق کاری کی اور ادب پاروں کو پنجاب کے حسن سیرت اور حسن صورت سے آراستہ کر دیا۔ ادیبوں اور شاعروں نے پنجاب کے گرد و پیش کی اشیا، مظاہر اور شخصی مزاج سے علائم و رموز اخذ کیے اور اردو زبان کا قومی مزاج متعین کرنے میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔ انشائیہ اور ماہیا وہ تحائف ہیں جو آزادی کے بعد اہل پنجاب نے اردو ادب کو محبت سے پیش کیے اور انھیں دساور میں بھی برآمد کیا۔

سرکاری طور پر اگرچہ اردو کی قبولیت کی رفتار مدھم ہے لیکن عوامی سطح پر اس زبان کی پذیرائی اور اس کے دفاع میں پنجاب پیش پیش ہے۔ نئے ادیبوں کی صورت میں پنجاب نے اردو زبان کو نیا خون فراہم کیا اور تخلیقی ادب میں پنجاب نے اتنے کارنامے انجام دیے ہیں کہ پورا ملک ان کارناموں کو افتخار کی نظر سے دیکھ سکتا ہے۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ آزادی کے بعد جن غیر مسلم اردو کے ادیبوں نے پنجاب سے ہندوستان کی طرف نقل مکانی کی تھی، اب انھیں کی تخلیقات سے بھارت کا اردو ادب جگمگا رہا ہے۔ پنجاب پاکستان کی قومی زبان و ادب میں ہی اہم کردار ادا نہیں کر رہا بلکہ اس خطے کے باشندوں نے بھارت کے اردو ادب کو معتبر کرنے میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔

قومی زبان و ادب کے ارتقاء میں پنجاب کی اس عطا کا اعتراف ضروری ہے۔

حواشی

۱۔ ڈاکٹر سہیل بخاری۔ "اردو کی کہانی" پہلی بات (ا) مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۷۵ء

۲۔ عین الحق فرید کوٹی۔ "اردو زبان کی قدیم تاریخ" ص ۳۱، ارسلان پبلی کیشنز، لاہور، جون ۱۹۷۲ء

۳۔ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ۔ تعارف۔ اردو زبان کی قدیم تاریخ" ص ۱۰۔ ۱۱، حوالہ ایضاً

۴۔ بحوالہ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ۔ (مقدمہ ابن خلدون۔ ترجمہ "روزن مقال") حوالہ ایضاً

۵۔ عین الحق فرید کوٹی نے لکھا ہے کہ کسی زبان کا دوسری زبان سے متاثر ہونا اور گہرے اثرات کے باوجود اس کا دوسری زبان سے مشتق ہونا دو مختلف باتیں ہیں۔ سنسکرت کے بارے میں ان کا نظریہ یہ ہے:

"سنسکرت نے مقامی زبانوں کو محض متاثر کیا ہے۔ انھیں نیست و نابود کر کے کسی نئی بولی کی طرح نہیں ڈالی۔ بلکہ حق تو یہ ہے کہ مقامی بولیوں کی مقبولیت کے زیر اثر خود ختم ہو گئی۔" "اردو زبان کی قدیم تاریخ" ص ۷۳

۶۔ انور سدید۔ ’’مختصر اردو کا سفر‘‘۔ ص ۷۔ مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۷ء

۷۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار۔ ’’تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند‘‘ (چھٹی جلد) ص ۴۳، پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۱۹۷۱ء

۸۔ سید سلیمان ندوی: نقوش سلیمانی۔ ص ۳۱۔ بحوالہ ’’تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند‘‘ (چھٹی جلد) ص ۴۳۔ اس نظریے کی تائید پیر حسام الدین راشدی نے بھی کی ہے۔

۹۔ فارغ بخاری۔ ’’ادبیات سرحد۔ اردو ادب‘‘ بحوالہ رضا ہمدانی۔ مقالہ ’’قومی زبان کی ترقی میں سرحد کا حصہ‘‘۔ اخبار اردو، اسلام آباد۔ شمارہ مارچ ۲۰۰۷ء۔ ص ۴۰ (ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اردو کا رشتہ پراکرتوں سے، عین الحق فرید کوٹی نے دراوڑی سے اور سہیل بخاری نے مہاراشٹری سے جوڑا ہے)

۱۰۔ حافظ محمود شیرانی۔ ’’پنجاب میں اردو‘‘ ص ۶۷۔ بحوالہ ’’تاریخ ادبیات پاک و ہند‘‘ (چھٹی جلد) ص ۴۹

۱۱۔ سونتی کمار چٹرجی۔ بحوالہ ’’تاریخ ادب اردو‘‘ مؤلفہ ڈاکٹر جمیل جالبی۔ جلد اول۔ ص ۵۹۴۔ مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۷۵ء

۱۲۔ محمد اکرام چغتائی۔ ’’پنجاب میں اردو‘‘ سالنامہ فنون۔ لاہور ۱۹۶۹ء۔ ص ۳۷۵۔ (بحوالہ ’’تاریخ ادب اردو‘‘۔ ڈاکٹر جمیل جالبی)

۱۳۔ ڈاکٹر جمیل جالبی۔ ’’تاریخ ادب اردو‘‘۔ جلد اول۔ ص ۵۹۶

۱۴۔ ایضاً۔ ص ۶۰۰

۱۵۔ یہاں پروفیسر حمید احمد خان کا یہ ارشاد بھی قابل غور ہے:

’’اردو اور پنجابی ان معنی میں دو مختلف زبانیں نہیں ہیں جن معنی میں فرانسیسی اور جرمن زبانیں ہیں۔‘‘ (بحوالہ جمیل جالبی، ص ۶۰۲)

۱۶۔ ڈاکٹر جمیل جالبی۔ ص ۶۰۲

۱۷۔ ڈاکٹر وحید قریشی۔ ’’پاکستانی قومیت کی تشکیل نو‘‘۔ ص ۱۲۴۔ لاہور ۱۹۸۳ء

۱۸۔ مولانا صلاح الدین احمد۔ مقالہ ’’اردو کی ترویج و ترقی کے ذرائع‘‘۔ ’’ادبی دنیا‘‘۔ لاہور

۱۹۔ پروفیسر حمید احمد خان۔ ’’تعلیم و تہذیب‘‘۔ ص ۱۵۹۔ لاہور ۱۹۷۵ء

۲۰۔ ڈاکٹر وزیر آغا۔ ’’نئے تناظر‘‘۔ ص ۹۴۔ لاہور ۱۹۸۱ء

۲۱۔ انور سدید۔ ’’اردو پنجاب کا عشق ہے‘‘۔ روزنامہ ’’نوائے وقت‘‘ لاہور ۱۰ اکتوبر ۱۹۷۸ء

۲۲۔ ایضاً

۲۳۔ علامہ اقبال۔ مولوی عبدالحق کے نام مکتوب۔ ۱۲ اکتوبر ۱۹۳۶ء

۲۴۔ انور سدید۔ ’’اردو پنجاب کا عشق ہے‘‘۔ نوائے وقت ۱۰ اکتوبر ۱۹۸۸ء

۲۵۔ حافظ محمود شیرانی۔ مقالات: جلد دوم۔ مجلس ترقی ادب لاہور۔ بحوالہ ڈاکٹر جمیل جالبی ’’تاریخ ادب اردو‘‘۔ ص ۶۰۲

۲۶۔ ڈاکٹر جمیل جالبی۔ ’’تاریخ ادب اردو‘‘۔ جلد اول، ص ۵۹۸

۲۷۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی۔ ’’مقدمہ جائزہ زبان اردو‘‘ (پنجاب)۔ ص ۲۔ مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۲۰۰۵ء

۲۸۔ ’’جائزہ زبان اردو (پنجاب)‘‘۔ مرتب خواجہ عبدالوحید (مرحوم) ص ۳، اسلام آباد، ۲۰۰۵

۲۹۔ انجمن ترقی اردو پنجاب کا قیام ۱۹۳۴ء کے لگ بھگ عمل میں آیا۔ پہلے صدر شیخ عبدالقادر مقرر ہوئے۔ وہ وزیر ہند کی کونسل کے رکن نامزد ہوئے تو صدارت کا عہدہ شمس العلماء میر ممتاز علی نے سنبھال لیا۔ انجمن کے سیکرٹری خواجہ عبدالوحید تھے جو لاہور کے ایک علمی و ادبی خاندان کے نامور فرد اور اردو کے ممتاز محقق، نقاد، شاعر اور کالم نگار مشفق خواجہ کے والد گرامی تھے۔ ’’جائزہ زبان اردو پنجاب‘‘ کا مسودہ بھی مشفق خواجہ صاحب کے پاس محفوظ تھا۔ اب مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد نے ڈاکٹر گوہر نوشاہی کے مقدمے کے ساتھ شائع کر دیا ہے۔

۳۰۔ جائزہ زبان اردو (پنجاب) ۱۹۳۵ء۔ مرتبہ خواجہ عبدالوحید۔ ص ۲۹ تا ۳۱

۳۱۔ ایضاً، ص ۴۳۔ یہ اعداد و شمار مردم شماری رپورٹ سے لیے گئے ہیں۔

۳۲۔ ڈاکٹر جمیل جالبی۔ ''تاریخ ادب اردو''۔ جلد اول ص ۲۳۔ مسعود سعد سلمان کا ہندوی دیوان نا پید ہے۔ امیر خسرو نے اس کا ذکر ''غرۃ الکمال'' کے دیباچے میں اور محمد عوفی نے ''لباب الالباب'' میں اس دیوان کا ذکر کیا ہے۔

۳۳۔ پنڈت برجموہن دتاتریہ ''کیفی۔ کیفیہ'' ص ۵۷

۳۴۔ حافظ محمود شیرانی۔ مقالہ ''پنجاب میں قدیم اردو ادب''۔ ''جائزہ زبان اردو، پنجاب''۔ حوالہ ایضاً ص ۸۵

۳۵۔ ایضاً، ص ۱۰۰

۳۶۔ ڈاکٹر ممتاز گوہر۔ ''پنجاب میں اردو کا ارتقاء'' (۱۸۴۹ تا ۱۹۱۴ء) صفحہ ۲۹ تا ۳۰۔ مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور ۱۹۹۷ء

۳۷۔ ہندوستان میں عیسائی مشنریوں نے اپنا تبلیغی کام مغلوں کے عہد میں شروع کر دیا تھا اور اسے مرور ایام کے ساتھ فروغ ملتا رہا۔ لیکن پنجاب میں یہ سرگرمیاں نیا دو نظر نہیں آتیں۔ پنجاب پر ۱۸۴۹ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے قبضے کے بعد یہ تبشیری سرگرمیاں زور پکڑتی نظر آتی ہیں۔ ان کے خلاف فکری اور مناظرانہ مباحثوں کے آثار بھی ملتے ہیں۔

۳۸۔ انور سدید۔ ''اردو ادب کی تحریکیں'' ص ۳۵۰۔ انجمن ترقی اردو پاکستان۔ کراچی ۱۹۹۶ء

۳۹۔ انور سدید، ''اردو ادب کی تحریکیں'' ص ۳۵۰۔ انجمن ترقی اردو پاکستان۔ کراچی ۱۹۹۶ء

۴۰۔ ڈاکٹر صفیہ بانو۔ ''انجمن پنجاب۔ تاریخ و خدمات'' ص ۴۳۵۔ کفایہ اکادمی، کراچی ۱۹۷۵ء

۴۱۔ ڈاکٹر ممتاز گوہر۔ ''پنجاب میں اردو ادب کا ارتقاء'' ۱۸۴۹ تا ۱۹۱۴۔ ص ۱۳۳

۴۲۔ بحوالہ حکیم احمد شجاع۔ ''خوں بہا'' ص ۱۸۲، لاہور ۱۹۵۱ء

۴۳۔ بحوالہ ''اقبال کے حضور''۔ از خواجہ عبدالوحید۔ ''نقوش'' اقبال نمبر۔ ص ۳۸۱۔ (فقی لاج اردو کے ممتاز ادیب محقق، ادیب اور شاعر مشفق خواجہ کے بزرگوں، خواجہ کریم بخش، خواجہ رحیم بخش اور خواجہ امیر بخش کی مشترکہ ملکیت تھا۔ ۱۹۰۵ء سے لے کر ۱۹۱۸ تک فقی لاج لاہور کا سب سے اہم تہذیبی اور ادبی و علمی مرکز رہا۔ (بحوالہ نقوش۔ اقبال نمبر۔ ص ۳۸۱)

۴۴۔ ڈاکٹر وحید قریشی۔ ''پاکستانی قومیت کی تشکیل نو'' ص ۹۸

۴۵۔ قائداعظم نے ۱۹۴۸ء میں ڈھاکہ میں ارشاد فرمایا:

''میں واضح الفاظ میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ پاکستان کی سرکاری زبان اردو اور صرف اردو ہوگی۔ جو شخص اس سلسلہ میں آپ کو غلط راستہ پر ڈالنے کی کوشش کرے وہ پاکستان کا پکا دشمن ہے۔ ایک مشترکہ قومی زبان کے بغیر کوئی قوم متحد پوری طرح متحد رہ سکتی ہے اور نہ کوئی کام کر سکتی ہے۔''

۴۶۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے لکھا ہے: ''تقسیم کے بعد اردو کی حمایت میں پنجاب نے زیادہ حصہ لیا ہے۔ (ڈاکٹر وحید قریشی۔ ''پاکستانی قومیت کی تشکیل نو''۔ ص ۱۰۰)

۴۷۔ مولانا صلاح الدین احمد۔ ''اردو کی ترویج و ترقی کے ذرائع'' ص ۱۲۷

۴۸۔ حمید احمد خان۔ ''تعلیم و تہذیب'' ص ۶۵

۴۹۔ ایضاً۔ ''مشرقی پاکستان کو توڑنے میں جو کردار لسانی تفریق نے ادا کیا ہے۔ اس کا مشاہدہ ہم سقوط ڈھاکہ کی صورت میں کر چکے ہیں۔

۵۰۔ ڈاکٹر وحید قریشی۔ ص ۹۹

:\makhzan\pictur for 14\New Folder\10.jpg not found.

ظہیر جاوید

کشمیر میں اردو

ریاست جموں کشمیر علم وحکمت، ہنر وفن کی سرزمین ہے۔اس خطے کے لوگ اپنے ورثے کو اپنی ہمت کے مطابق سنبھالنے، دوسروں سے سیکھنے اور فن کو نکتۂ کمال تک پہنچانے کے قائل رہے ہیں۔چنانچہ آج سے پانچ ہزار ایک سو سال پہلے جب آریہ کوہ ہندوکش اور قراقرم کو عبور کر کے وادیٔ کشمیر میں داخل ہوئے تو ان کی تہذیب وتمدن کو اختیار کرتے ہوئے اس بات کا دھیان رکھا گیا کہ نتو پشاچہ قبائل کی بولی کشمیری قصہ ماضی بنے اور نہ ناگا قبائل کی مذہبی رسوم میں کوئی آنچ آئے۔

آریہ کی زبان سنسکرت تھی، کشمیریوں نے اس زبان کو کچھ اس طرح سنوارا کہ آریہ کا جو دوسرا گروہ افغانستان کے راستے ہندوستان میں داخل ہوا تھا وہ بھی کشمیریوں کی فصاحت وبلاغت کا قائل ہو گیا۔چنانچہ ہندوستان سے لوگ سنسکرت سیکھنے سرینگر آنے لگے، اسی طرح جب اشوک نے بدھ مت کو پھیلانے کے لیے قدم بڑھایا تو اسے سب سے زیادہ پذیرائی ریاست جموں کشمیر میں ملی۔پانچ ہزار بدھ بھکشو اس خطے میں آ کر آباد ہوئے اور اپنے ساتھ زعفران کا تحفہ لائے۔کشمیریوں نے اس مذہب کو پھیلانے میں بڑا کام کیا۔ناگ ارجن، کمارجیوا، سنگھابوتی، گناورمن نے چین سے جاوا تک نہ صرف اسے عام کیا بلکہ بدھ لٹریچر کے مختلف زبانوں میں ترجمے بھی کیے۔

اس خطے میں فارسی کا عمل دخل شاہ ہمدان، میر سید علی ہمدانی کی آمد سے زیادہ ہوتا ہے وہ ۱۳۷۲ء میں اپنے ساتھ سات سو علماء، صوفی اور دستکار لے کر آئے تھے جنہوں نے ریاست میں پھیل کر اسلام کی تبلیغ ہی نہیں کی بلکہ اہل کشمیر کو کئی فنون میں طاق بھی کیا۔شال بنانے والے شاہ ہمدان کے ساتھ کشمیر میں وارد ہوئے تھے ان سے سیکھ کے علی بابا، مصطفیٰ، عزیز پنڈت، خواجہ یوسف جیسے کاریگروں نے اسے اتنا نفیس بنا دیا کہ نپولین کے زمانے میں اہل یورپ کے لیے کشمیری شال امارت کی علامت بن گئی۔

کشمیر گنگناتے ہوئے چشموں، شوریدہ ندیوں، گاتے، دھوم مچاتے ہوئے دریاؤں، پرسکون جھیلوں کی سرزمین ہے۔ اسے اونچے اونچے برف پوش پہاڑوں نے گھیر رکھا ہے۔خدا کی اس بستی پر ہر وقت رنگ ونور کی بارش ہوتی رہتی ہے اور پھولوں، پھلوں، زعفران اور سرسوں کی خوشبو حلقہ باندھے کھڑی رہتی ہے، یہاں جو آتا ہے کشمیر کے حسن کے گیت گاتا ہے، قدسی نے اس زمین پر قدم رکھا تو کہا:

نبود اہلِ جناں را سیر گاہے
بہ کشمیر از جہاں کردند راہے

کتنی خوبصورت تعریف ہے کہ اہل جنت کے لیے کوئی سیرگاہ نہیں تھی، اس لیے قدرت نے کشمیر کو تخلیق کر دیا۔
مغل تاجدار نورالدین جہانگیر کو دیکھیے کہ اس کی نظر جب وادی کشمیر میں پڑی تو بے ساختہ پکار اٹھا کہ:

اگر فردوس بر روئے زمیں است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

باہر سے ریاست جموں و کشمیر میں آنے والوں کی تعریف و توصیف نے جہاں کشمیر کے حسن فطرت کے بیان کو شعر و نغمے کا حصہ بنا دیا، وہاں ظلم و ستم نے پہلے حزنیہ شاعری اور پھر انقلابی شاعری کو عام کیا۔ کشمیریوں کی اردو شاعری میں ان تینوں رنگوں کا نمونہ یوں ہے کہ:

نکہتیں پھیلی ہوئی ہیں، دہر خوشبو زار ہے
مشک بو خاکِ چمن ہے ذرہ عنبر بار ہے
حسن خزگانِ بتاں دلچسپ اک اک خار ہے
گلی کدے کا گل کدہ تصویرِ روئے یار ہے

پنڈت دینا ناتھ مست نے یہ اشعار جھیل ڈل کی شان میں لکھے تھے۔ ضیاء الحسن ضیاء کی ایک نظم کشمیر کا حال یوں بیان کرتی ہے کہ:

جفائے غیر سے برہم قرار کی محفل
ستم ظریفیِ دوراں سے انجمن مغموم
ستم گروں کے تسلط سے پھول پژمردہ
خزاں کے ہاتھ سے رعنائیِ چمن مغموم

مرزا مطیع اللہ رعنا مہاراجہ کشمیر کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں کہ:

امرا کا جہاں رہتا ہو سرِ عرش مزاج
جہاں تہذیب ہو سرمائے کے ہاتھوں تاراج
جہاں انصاف ہو اک مشغلہ عیاروں کا
جہاں آئین ہو اک طنطنہ زرداروں کا
ایسے حالات میں پھر جرمِ بغاوت کیوں ہو
حق کے داعی کا عمل وجہِ شکایت کیوں ہو
تم سمجھتے ہو مجھے باغی ہے تو باغی ہی سہی

ریاست جموں کشمیر کے متعلق یہ بات سمجھنے کی ہے کہ یہ علاقہ بڑا دشوار گزار رہا ہے۔ اس حد تک دشوار گزار کہ ریاست کے اندر کے لوگوں کے درمیان بھی میل ملاپ بڑا محدود تھا۔ چنانچہ جموں میں ڈوگری، پونچھ میں پہاڑی، وادی میں کشمیری، گلگت میں شینا اور بروشسکی اور لداخ میں لداخی بولنے والے ایک دوسرے کی بات سننے اور سمجھنے سے قاصر تھے۔ ان کے درمیان رابطے کی کوئی زبان نہیں تھی۔ سنسکرت اور فارسی بھی ریاست میں یہ مقام نہ حاصل کر سکیں۔ انہیں اردو نے آ کے ایک لڑی میں باندھا تو انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں کشمیری عوام ایک دوسرے کے ساتھ رابطے اور اہل ہند کے ساتھ تعلق قائم کرنے کے لیے اس زبان کو استعمال کرنے لگے۔

اردو لشکری زبان ہے۔ گجرات کاٹھیاواڑ اور حیدرآباد دکن سے اپنا علمی سفر شروع کرنے سے پہلے یہ مختلف زبانیں بولنے والے عامیوں کے درمیان رابطے کا ایک ذریعہ بن چکی تھی، گو اس وقت اس کی حالت ٹوٹی پھوٹی تھی، مگر لوگ اس سے اپنے مطلب کی بات نکال لیتے تھے۔ کشمیری اس ابتدائی زمانے میں ہی اس سے متعارف ہونے لگے تھے اور متعارف ہونے کی سہولت انہیں ان راستوں نے فراہم کی تھی جو اکبر اعظم اور نورالدین جہانگیر کے دور میں تعمیر ہوئے تھے۔ اس سے پہلے اہل کشمیر کے تمام روابط وسط ایشیا سے تھے، تاجکستان، کرغستان، ازبکستان، چین اور افغانستان کے ساتھ ان کے قریبی مراسم تھے۔ پھر جب اکبر سے اورنگ زیب عالمگیر تک تمام مغل بادشاہوں نے کشمیر کی سیر اور کشمیر میں عمارتوں کی تعمیر کو اپنا معمول بنایا تو کشمیری بھی پہاڑوں سے اتر کے پشاور، لاہور اور دہلی آنے لگے۔ اس طرح دہلی کا دبستان اردو آباد ہونے سے پہلے ہی اردو ریاست جموں کشمیر میں رواں ہوگئی۔ یہ بات اس مثنوی سے ثابت ہوتی ہے جو ۱۱۳۱ھ میں میرپور کے میاں غلام محی الدین نے لکھی اور جو آج بھی محفوظ ہے۔ پانچ سو سے زائد اشعار کی اس مثنوی کے آخر میں میاں غلام محی الدین کہتے ہیں کہ:

اکتیس برس اور یاراں سو
ہجرت نہیں ہوئی تھی تو
پیغمبر پہ اور آل کرام
لاکھ درود اور لاکھ سلام

اس مثنوی کا نام "گلزار فقر" ہے۔ اس کی اردو دکنی زبان سے قریب تر ہے۔ اس کے بعد ہمیں اردو کی پہلی غزل محمود گامی کے اشعار میں ملتی ہے۔ محمود گامی کا سن پیدائش ۱۷۶۵ء اور سن وفات ۱۸۵۵ء ہے۔ گامی شاعری میں اپنے دور کے امام تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

شیریں وہ انارش بکنار من او
پروردہ بچے عاشقِ بیمار اچھا ہے
مستانہ زاحوالِ اسیراں بہ تغافل
درکارِ خود ہشیار وہ سرکار اچھا ہے

گلزار فقر، اردو زبان کے کشمیری عوام تک رسائی کا پتہ دیتی ہے جبکہ اردو کی پہلی غزل دربار میں اس کے دخیل ہونے کی تاریخ بیان کرتی ہے اور ان دونوں کے درمیان قریب قریب ایک صدی کا فاصلہ ہے۔ گامی کا جب انتقال ہوا ہے تو ریاست جموں کشمیر میں ڈوگروں کی حکمرانی قائم ہو چکی تھی اور فارسی جس نے سکھوں کے دور حکومت میں رخت سفر باندھنا شروع کر دیا تھا اردو کو اپنی جگہ بٹھانے لگی تھی، گامی کے بعد جب انقلابی شاعروں کا دور آیا تو پیرزادہ غلام احمد مہجور نے جن کا کشمیری کلام آگ بھڑکا رہا تھا اردو میں فرمایا کہ:

آنکھ نرگس کی کھلی، سنبل نے زلفیں کھول دیں
ہے گلِ بادام، مست لذتِ جامِ نشاط
سبزہ نوخیز میں رقص عروسِ نو بہار
جھومتا پھرتا ہے گویا بادۂ آشامِ نشاط

ریاست میں اردو کی پہلی مثنوی ۱۸۰۵ء میں لکھی گئی، یہ ڈیڑھ سو صفحات پر مشتمل چوہدری شیر سنگھ کی رپورٹ ہے جو انہوں

نے بخارا سے واپسی پر مہاراجہ کے لیے لکھی تھی اور جس میں تجارتی وسیاسی تعلقات کے امکان کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ریاست میں اردو کا پہلا پرنٹنگ پریس اس رپورٹ کے تین سال بعد قائم ہوا۔ مگر ریاست کے اندر صحافت کو اظہار کا ذریعہ بنانا مسلمانوں کے لیے ۱۹۳۲ء میں سے پہلے ممکن نہیں ہوا، البتہ پرتاپ سنگھ کے دورِ حکومت میں جو ۱۸۸۵ء سے ۱۹۲۵ء تک رہا سکولوں اور کالجوں کا قیام ضرور عمل میں آیا۔ اور اردو کو باضابطہ سرکاری اور قومی زبان کا درجہ دیا گیا، اس وقت سے آج تک ریاست جموں کشمیر میں تمام کارروائی اسی زبان میں ہو رہی ہے۔

اردو کو بھرپور انداز میں ہندوستان سے اٹھا کر ریاست میں وہ لوگ لائے جنہوں نے افغانوں اور سکھوں کے مظالم سے تنگ آ کر لاہور اور دہلی کا رخ کیا تھا۔ یہ عام لوگ تھے اور ان کی بدولت اردو کسی ایک طبقے یا علاقے تک محدود نہ رہی بلکہ ساری ریاست میں پھیل گئی۔ اس طرح لسانی اعتبار سے منقسم کشمیریوں کو پہلی بار رابطے کی ایک زبان میسر آئی، پھر جب ڈوگروں کی حکمرانی شروع ہوئی تو گلاب سنگھ نے اپنی شان بڑھانے کے لیے دہلی سے درباری نقیب اور اپنی محافظت کے لیے رام پور سے روہیلہ سپاہی منگوائے، پھر اس نے انتظامی امور کے لیے چن چن کے لائق ہندوستانی ملازم رکھے، یہ سب اپنے ساتھ اردو لائے۔ عوامی اردو کے ساتھ ساتھ شرفا کی اردو بھی آئی اور بے شمار لوگ اردو کو عام اور خالص کرنے کے کام میں جت گئے، ان میں مشیر مال خوشی محمد ناظر، ہائیکورٹ کے جج پیرزادہ محمد حسین عارف، نائب سیکرٹری خارجہ برج موہن، کیفی دہلوی، کشمیر ریذیڈنسی کے منشی سراج الدین احمد، منشی محمد دین فوق، حکیم فیروزالدین طغرائی، لالہ کنورسین، اور صاحبزادہ محمد عمر پیش پیش تھے۔ ان صاحبان نے ادبی مجالس کا اہتمام کیا۔ مولوی نذیر احمد، مولانا شبلی، مولانا شرر، عبدالماجد دریا آبادی اور غلام بھیک نیرنگ جیسے بزرگوں کی تقریروں سے اردو کا طلسم باندھا، مشاعروں کا بندوبست کیا، ہندوستان کے ہر بڑے شاعر کو بلایا اور کشمیریوں کو الفاظ کی بندش کا سلیقہ سکھایا۔ پھر ماسٹر غلام حیدر نے سٹیج ڈراموں کا سلسلہ شروع کیا اور تفریح تفریح میں اردو کو عام کرنے لگے۔

انیسویں صدی میں ریاست جموں کشمیر میں منشی سراج الدین احمد اس پائے کے ادیب اور شاعر ہوئے کہ علامہ اقبال، شاہ دین ہمایوں، خوشی محمد ناظر جیسے اپنا کلام ان کے پاس بھیجتے اور ان سے مشورہ لینے کے بعد ہی مشاعرے میں پڑھتے یا کسی رسالے کو طبع کرنے کی اجازت دیتے تھے۔ بیسویں صدی آئی تو کشمیری اردو ادب کی تمام اصناف پر چھاتے گئے۔ علامہ اقبال شاعرِ مشرق کے مقام پر جا بیٹھے۔ کیفی، دہلوی، چکبست، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم نے شعر و نغمے میں نام پیدا کیا۔ آغا حشر نے ڈرامے میں، کرشن چندر نے افسانے میں، میرا جی نے گیت میں، منشی محمد دین فوق نے تاریخ نویسی میں نام پیدا کیا۔ ان سب میں زیادہ مقبول چراغ حسن حسرت ہوئے جن کے شعر و ادب کی تعریف مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خان اور علامہ اقبال نے کھل کر کی۔ حسرت کہتے ہیں کہ:

محبت کس قدر یاس آفریں معلوم ہوتی ہے
کہ تیرے لب کی ہر جنبش نہیں معلوم ہوتی ہے
جوانی مٹ گئی لیکن خلش دردِ محبت کی
جہاں معلوم ہوتی تھی، وہیں معلوم ہوتی ہے

میں اپنی بات اس فقرے پر ختم کرتا ہوں کہ دکن، دہلی، لکھنؤ اور لاہور کے ساتھ ساتھ کشمیر کو بھی دبستانِ اردو کا مقام حاصل ہے۔

:\makhzan\picture for 14\New Folder\3.jpg not found.

شہزاد احمد

اردو اور جدید علوم

نظریہ ارتقا کے خلاف بہت کچھ لکھا گیا ہے اور کچھ دلائل تو ایسے ہیں جن کا توڑ ممکن ہی نہیں۔ مثلاً یہ کہ مختلف انواع میں یہ قوت کہاں سے آئی کہ وہ کرۂ ارض پر ظاہر ہونے والا سردیوں کا موسم گزار سکیں، حالاں کہ اس سے پہلے یہ انواع اس تجربے سے گزری ہی نہیں تھیں۔ اس کے بعد یہ سوال قدرتی طور پر اٹھانا پڑتا ہے کہ کیا قدرت پیش بینی کر سکتی ہے؟ اگر جواب نفی میں ہو تو پھر یہ سمجھنا بہت مشکل ہو جاتا ہے کہ وقت آنے سے پہلے ہی انواع میں مدافعت کی قوت کہاں سے آ جاتی ہے؟ اگر اس سوال کا جواب اثبات میں دیا جائے تو ارتقا میں بہترین کا باقی رہ جانا غیر متعلق رائے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔

میں نے اس پیراگراف میں کوشش کی ہے کہ میں انگریزی کا جملہ یا نیم جملہ استعمال نہ کروں لیکن آپ نے دیکھا کہ اس کے باوجود انگریزی زبان کے اثرات اس تحریر سے نمایاں ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ایک بنیادی جدید نظریہ بھی اس سے چھلکا پڑتا ہے۔ ہم علم اور ادب کی جس سطح پر اس وقت ہیں وہاں ہمیں ایک معیاری تبدیلی کی ضرورت ہے، ایک ایسی تبدیلی جو سب کچھ بدل کر رکھ دے۔ ہمارا جی یہ بھی چاہتا ہے کہ تبدیلی جزرک نوعیت کی ہو کیوں کہ قمیض کے ساتھ محض ٹائی لگانے سے، ہم جدید عہد میں داخل نہیں ہو سکتے۔

تاہم جس روایت کے ساتھ ہمارا تعلق ہے وہ بھی کوئی معمولی روایت نہیں ہے۔ یونانی دور سے لے کر جدید دور تک صرف ایک ہی جادہ موجود ہے اور وہ مسلمانوں کا بنایا ہوا ہے۔ یورپ کے محققین نے جان بوجھ کر اس کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش کی ہے اور اس عظیم دور کو تاریک زمانہ قرار دیا ہے۔ اگر یہ زمانہ واقعی تاریک دور ہوتا تو ہم اس سے نکل نہ پاتے۔ اقبال نے استقرائی طریق کار کو جدید دور کی یاد قرار دیتے ہوئے یہ بھی کہا ہے کہ صحیح معنوں میں مسلمانوں نے ہی اس کی قوت اور نوعیت کو سمجھا ہے۔ مگر دوسری طرف رسل کا اعتراض یہ ہے کہ مسلمانوں نے مواد تو بہت جمع کیا مگر اس سے نتیجہ نہ نکال سکے؟ یہ بات کلی طور پر تو درست نہیں مگر جزوی طور پر اسے غلط نہیں کہا جا سکتا۔ تاہم اتنا ضرور سمجھ لینا چاہیے کہ اگر مسلمان یہ جست لے لیتے تو ان کا عہد اور بھی زیادہ روشن ہو جاتا۔

ہر نظریے کی پیدائش کا ایک وقت ہوتا ہے اور تاریخی سطح پر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ وقت سے پہلے کوئی شے نمودار نہیں ہوتی۔ تجاذب (Gravity) کا نظریہ ہی لے لیجیے، بہت سے مفکر اس تک پہنچے مگر اسے دریافت نہ کر سکے۔ خصوصاً کیپلر کے تین آسمانی اصولوں کی بنیاد بھی نظریہ ہے مگر اس نے اسے رسمی طور پر دریافت نہیں کیا، یہ سعادت نیوٹن کے حصے میں آئی۔

ایسی ہی صورت ارتقا کے نظریے کے سلسلے میں بھی رہی مگر انیسویں صدی میں بیک وقت ڈارون، ویلس اور سپنسر نے اسے دریافت کیا۔ اب ہم اس نظریے کی مدد کے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں چل سکتے۔

تیسری دنیا کے ممالک نے موجود ترقی میں بہت کم حصہ لیا ہے۔ چنانچہ سائنسی حلقے یہ کہتے ہیں کہ ان کی مدد کرنا بھی ضروری

نہیں ہے۔اس لیے تیسری دنیا کے ممالک کو اپنا رستہ خود ہی بنانا ہوگا۔مغرب نے بھی قرون وسطیٰ کے دوران اپنا رستہ خود ہی بنایا تھا۔ مسلمان مفکر، جن میں خاص طور پر ابن خلدون قابل ذکر ہے، یہ ماننے کو تیار ہی نہیں تھا کہ مغربی اقوام ترقی کر سکتی ہیں۔حالاں کہ وہ فلسفہ تاریخ کا موجد کہا جاتا ہے اور اس نظریے کی بنیاد بھی یہی ہے کہ ترقی مختلف ادوار مختلف اقوام کی مدد سے ہوتی ہے۔

عربوں نے یہ علم بنیادی طور پر سریانی زبان کے ذریعے حاصل کیا تھا۔اور بعد میں انہوں نے دوسری زبانوں سے بھی تراجم کیے تھے۔کوئی سات سو برس ایسے ہیں جن میں علم کے میدان میں مسلمانوں کا طوطی بولتا رہا۔تیسری دنیا کے دیگر ممالک جن میں چین اور بھارت خاص طور پر قابل ذکر ہیں، اپنے اپنے دائرہ کار میں خاصے ترقی یافتہ ہو چکے تھے۔مگر جہاں تک سائنس اور ٹیکنالوجی کا تعلق ہے، اس میں ان کی ترقی بہت آہستہ روتھی۔

اب مغرب نے علوم کا ڈھیر لگا دیا ہے۔معلومات اس قدر زیادہ ہیں کہ ہم کسی ایک چھوٹے سے گوشے کے بارے میں بھی اگر جاننا چاہیں تو سب کچھ نہیں جان سکتے۔آسمان اور سمندر ہی نہیں خود ایٹم بھی حیران کن پہلو لیے ہوئے ہے۔اب ہماری ترقی کا دارومدار اس رویئے پر ہے جو ہم ان علوم کے سلسلے میں اختیار کرتے ہیں۔

ترقی یافتہ ممالک اپنے تمام تر دعوؤں کے باوجود ہماری مدد کرنے کو تیار نہیں ہیں۔تاہم ان علوم کو حاصل کرنا پھر بھی ممکن ہے اور اس کے لیے ہر حالت میں ہمیں انگریزی زبان سے مدد لینی ہوگی۔ویسی ہی مدد جیسی کہ قرون وسطیٰ میں عربی سے لی جاتی تھی۔مگر اس مواد کو مقامی زبانوں میں بھی منتقل کرنا ضروری ہے۔اگر ہم ایسا نہ کر پائے تو زبانیں اپنی موت مر جائیں گی۔تو یہ درست ہے کہ اب کوئی سائنس کانفرنس جو بین الاقوامی نوعیت کی ہو انگریزی کے علاوہ کسی اور زبان میں منعقد نہیں ہوتی مگر کئی زبانیں ایسی ہیں، جو اپنے طور پر اپنی ہی زبان میں بنیادی سائنسی کام کر رہی ہیں۔یہ کام اردو میں بھی کیا جا سکتا ہے۔ٹیکنالوجی کے اعتبار سے ہم نے بہت سے کام اردو اور دیگر پاکستانی زبانوں کی مدد سے کیے ہیں۔مگر جب تک ہم سائنس کے بارے میں بنیادی نظریے اپنی زبان میں ہر سطح پر متعارف نہیں کراتے، ہم ترقی یافتہ قوم کہلوانے کے حقدار نہیں ہیں۔

تدریسی سطح پر سب سے بڑا مرحلہ اصطلاحات کے تراجم کا ہے، کچھ لوگ جن میں ڈاکٹر عبدالسلام بھی شامل ہیں یہ سمجھتے ہیں کہ اصطلاحات کو ان کی جز کی صورت میں قبول کر لینا چاہیے۔مثلاً بلیک ہول یا Event Horizen کا ترجمہ کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا، آخر ہم طالب علموں کو اس عذاب میں کیوں ڈالیں کہ وہ ہزاروں اصطلاحات کو اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں سیکھیں۔

دوسری طرف یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جن اصطلاحات کا ترجمہ ہو سکتا ہے،ان کا ترجمہ نہ کرنا اردو کو اس کے مرتبے سے گرانے کے مترادف ہے۔چنانچہ کوئی درمیانی راہ نکالنی پڑے گی اور جو اصطلاحات ہم اردو میں بنائیں گے ان کو Standard بھی کرنا پڑے گا۔ بصورت دیگر ایک ہی لفظ یا اصطلاح کی کئی صورتیں سامنے آجائیں گی اور الجھاؤ میں مزید اضافہ ہو جائے گا۔

اس وقت صورت حال ایسی ہی ہے۔میرے خیال میں مقتدرہ قومی زبان کو یہ خدمت سرانجام دینی چاہیے۔اردو کو سرکاری زبان بنانے کا مسئلہ شاید اب ہمیشہ کے لیے سرد خانے میں ڈال دیا گیا ہے۔سرکار اس عیاشی کو مشکل ہی سے برداشت کر رہی ہے۔ نوجوانوں کو جان بوجھ کر اردو سے دور رکھا جا رہا ہے۔

اس صورت حال میں صرف ایک ہی بات کہی جا سکتی ہے، اگر یورپ والے اپنی روایات کو قائم رکھے بغیر عربوں کے علوم قبول کر لیتے تو وہ الجھاؤ کا شکار ہو جاتے۔شروع شروع میں ایسا ہوا بھی، پھر انہوں نے ایک سوچے سمجھے انداز میں عربی سے مستعار علوم کی اہمیت سے انکار بھی کیا مگر کب تک۔ہمیں یہ غلطی دہرانے کی ضرورت نہیں۔ہمیں انگریزی سے تعلق قائم رکھنا ہوگا اور اپنی سائنس اور ٹیکنالوجی اردو میں بنانی ہوگی۔

E:\makhzan\picture for 14\New Folder\4.jpg not found.

پروفیسر ڈاکٹر فردوس انور قاضی

اردو بحیثیت سرکاری زبان

اس سے قبل کہ "اردو بحیثیت سرکاری زبان" کے موضوع پر اظہار خیال کیا جائے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان حقائق کو سمجھا جائے جو قائداعظم کے اس فرمان کے باوجود:

"کہ اگر پاکستان کے مختلف حصوں کو متحد ہو کر ترقی کے راستے پر گامزن ہونا ہے تو
اس کی سرکاری زبان صرف اردو ہو سکتی ہے۔"

وہ کون سے عوامل اور محرکات تھے جنھوں نے آزادی حاصل کرنے کے باوجود انگریزی کو قومی زبان کے راستے میں اب تک حائل رکھا ہے اس بات کی وضاحت کے لیے پاکستان کے تعلیمی نظام اور معیار کا جائزہ لینا پڑے گا۔ کیونکہ کسی ملک کی سرکاری زبان وہی ہوتی ہے جو اس کا ذریعہ تعلیم بھی ہو۔

تاریخی اعتبار سے پاکستان کے تعلیمی نظام کی تاریخ زیادہ پرانی نہیں ہے۔ اصولی طور پر اس کا آغاز ۱۹۴۷ء میں دو قومی نظریے کی بنیاد پر قائم ایک آزاد مملکت کے قیام کے ساتھ ہونا چاہیے تھا۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو ہمارے موجودہ تعلیمی نظام کا سلسلہ ۱۸۳۵ء سے جڑا ہوا نظر آئے گا۔ اس تعلیمی نظام کا آغاز لارڈ میکالے کی اس تقریر کے بعد ہوا تھا جو اس نے برٹش پارلیمنٹ میں ۲ فروری ۱۸۳۵ء میں کی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ میں برصغیر کے چپے چپے میں گھوما ہوں لیکن ایک شخص بھی ایسا نہیں ملا جس کا ہاتھ پھیلا ہوا ہو یا وہ چور ہو۔ میں نے اس ملک میں تہذیب و ثقافت اور علم کی وہ دولت دیکھی کہ میرا نہیں خیال کہ ہم اس قوم کو فتح کرنے کا تصور بھی کر سکتے ہیں۔

> "unless we break the very backbone of this nation, which is the spiritual and cultural heritage, and, therefore, I propose that we replace her old and ancient education system, her culture, for if the Indians think that all that is foreign and English is good and greater than their own, they will lose their self-esteem, their native self-culture and they will

become what we want them, a truly dominated nation."

یہی وہ استعماری سوچ تھی جس کے تحت ایسٹ انڈیا کمپنی نے برِصغیر کے عوام، خصوصاً مسلمانوں کی Backbone کو ناکارہ بنانے کے لیے صدیوں پر محیط ان کے علمی سفر سیاسی اور فکری بصیرت کو ایک ایسی زبان کے تابع کر دیا جو علمی تہذیبی اور ثقافتی ہر لحاظ سے ایک اجنبی زبان تھی۔ بات صرف اجنبی زبان تک ہی محدود نہیں تھی بلکہ اس کو بھی انھوں نے علمی سطح پر وسعت دینے کی بجائے اپنی دفتری ضرورت کے مطابق صرف کلرک پیدا کرنے تک محدود رکھا یعنی بلّی نے شیر کو درخت پر چڑھنا پھر بھی نہیں سکھایا۔

یہاں ڈاکٹر خواجہ صلاح الدین (ڈائریکٹر انسٹی ٹیوٹ آف کیمسٹری یونیورسٹی) کی ۳ نومبر ۱۹۷۳ء کی تقریر کا یہ حصہ قابلِ غور ہے، جس میں انھوں نے کہا تھا:

"انگریزی غلامی کی یادگار اور افسر شاہی کا نشان وقار رہے ورنہ پاکستان میں جو انگریزی جاری ہے وہ انگریزوں کی نظر میں شرمناک ہے۔"

۱۸۳۵ء میں مسلمانوں کی حکومت ختم کرنے، ان کی صنعت اور تجارت کے راستے مسدود کرنے کے بعد انگریزی تعلیم کا وہ نظام جو محض کلرک بنانے کے لیے رائج کیا گیا تھا اس کو معاشی مجبوریوں کے ساتھ اس طرح جوڑ دیا گیا کہ وہ عالم فاضل طبقہ جو مشرقی علوم و فنون کا ماہر تھا یکایک ان پڑھ اور جاہل ہو گیا۔ کیونکہ انگریزی حکومت کے دفاتر میں انگریزی لکھنا اور پڑھنا جاننے والے منشیوں کے لیے ان کی آنے والی زندگی میں صحیح علوم و فنون کا حصول یا کائنات گیر افکار و نظریات کی کوئی گنجائش موجود نہیں تھی۔

۱۸۳۵ء کے بعد انگریزوں نے برصغیر کے عوام کو دوررس حکمتِ عملی کے تحت اپنی نوآبادی بنایا اور مذکورہ تعلیمی نظام کے ذریعہ ایک خاص طبقے کو انگریزی زدہ کیا اور غلامی کی اس سطح تک پہنچایا کہ وہ ہمیشہ کے لیے ذہنی طور پر ان کی ایسی نوآبادی بن گئے کہ آزادی کے بعد اپنی پوری قوم کو آزادی کی نعمت سے بہرہ مند نہیں ہونے دیا۔ نوآبادیاتی طرزِ عمل کو جاری رکھا اور تعلیمی نظام کو اس سطح تک کبھی نہیں آنے دیا جہاں سے پوری قوم کی خداداد صلاحیتوں سے ملک کو فائدہ پہنچتا اور ترقی کا عمل شروع ہوتا۔ ان نتائج کے حصول کے لیے انگریزوں نے ہندوستان میں اپنی آمد اور استعماری غلبے کے بعد انگریزی زبان کو سرکاری زبان بنانے کا عمل اچانک رائج نہیں کیا تھا۔ ابتدا میں انھوں نے مسلمانوں کی ہزار سالہ حکومت میں رائج سرکاری علمی اور عدالتی زبان فارسی کو ہٹانے کے لیے ۱۸۳۷ء میں عوامی سطح پر مقبول اور عام فہم زبان اردو کو دفتری زبان بنایا تاکہ برصغیر کے عوام خصوصاً مسلمانوں کی مخالفت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اردو کو سرکاری زبان بنانے کے بعد ہندوؤں کے اندر تعصب اور نفرت کو بھڑکایا جس نے دونوں قوموں کے درمیان آزادی کی مشترکہ جدوجہد کو شدید نقصان پہنچایا جس کے بعد ہندوؤں نے آزادی کی مشترکہ جدوجہد کے بجائے یہ مطالبہ شروع کر دیا کہ دفتروں اور عدالتوں میں اردو کی بجائے ہندی رائج کی جائے۔ ہندی اور اردو دراصل ایک ہی زبان تھی جس نے مسلمانوں کی برصغیر میں آمد اور ایک ہزار سالہ ہندی مسلم تہذیب و ثقافت اور مقامی زبانوں کی ہم آہنگی سے جنم لیا تھا۔ لیکن اردو چونکہ مسلم تہذیب و ثقافت کی نمائندہ زبان سمجھی جاتی تھی، لہٰذا ہندوؤں نے اس زبان میں موجود فارسی کے مانوس الفاظ کی جگہ سنسکرت کے غیر مانوس الفاظ شامل کر کے اس زبان کو فارسی رسم الخط کی بجائے دیوناگری رسم الخط میں تبدیل کرنے کا تقاضہ شروع کر دیا۔ یہی وہ نازک موڑ

تھا جب آزادی کے لیے ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ کاوشوں کا رخ تبدیل ہوا اور دو قومی نظریے کی بنیاد پڑی۔

یہاں اس تفصیل کا مقصد تاریخ دہرانا نہیں ہے بلکہ اردو زبان کی اس اہمیت کو سمجھنا ہے جو پاکستان کی تشکیل میں ایک اہم رکن کی حیثیت رکھتی ہے لیکن جسے مملکت کے حصول کے بعد نظر انداز کر دیا گیا۔

یہاں ایک اور اہم موضوع کی طرف اشارہ کرنا بھی ضروری ہے کہ پاکستان میں اردو کے ساتھ ساتھ صوبائی اور علاقائی سطح پر اور بہت سی زبانیں اہمیت کی حامل ہیں۔ یہ تمام زبانیں تھوڑے یا زیادہ فرق کے ساتھ ایک ہی تمدنی تاریخ سے جڑی ہوئی ہیں۔ ان کے الفاظ، قواعد اور رسم الخط ایک ہی مآخذ اور تہذیبی ورثے سے تعلق رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ تمام زبانیں قومی زبان اردو کے ساتھ ایک ایسے رشتے میں گندھی ہوئی ہیں جو محبت و اخوت اور باہمی رابطے کا رشتہ ہے اور تمام زبانیں ایک دوسرے کے ساتھ اسی طرح زندہ اور قائم ہیں جس طرح ایک مضبوط اور اعلیٰ خاندان باہمی سطح پر نسل در نسل زندگی کے تسلسل کو برقرار رکھتا ہے جس کے افراد نہ صرف ایک دوسرے کی شناخت کا ذریعہ بنتے ہیں بلکہ مشکلات اور مسائل کے درمیان ایک دوسرے کے تحفظ اور بقاء کی ضمانت بھی ہوتے ہیں۔ جہاں تک زبان کا تعلق ہے دنیا کے بیشتر ممالک میں متعدد زبانیں بولی جاتی ہیں۔ لیکن قومی زبان صرف ایک ہی ہوتی ہے ایک ایسی زبان جو پورے ملک میں یکساں طور پر بولی اور سمجھی جاتی ہو اور جس کا دامن اتنا وسیع ہو کہ وہ دنیا کے تمام علوم و فنون کو اپنے دامن میں سمیٹ لینے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ غور کیا جائے تو تمام ترقی یافتہ اقوام نے اپنی قومی زبان ہی کو سرکاری، عدالتی اور تعلیمی زبان بنایا جس کے سبب وہاں پوری قوم کی صلاحیتیں بروئے کار آئیں۔ ان کی خود اعتمادی برقرار رہی اور وہ آزادی کے ساتھ ترقی کا سفر طے کر سکیں۔

پاکستان میں بھی اس مسئلے کو سمجھا گیا لسانی مسائل کو حل کرنے کے لیے متعدد بار لسانی کانفرنسیں منعقد ہوئیں لیکن بدقسمتی سے ان کانفرنسوں کا انعقاد بھی زیادہ تر اُسی، انگریزی زدہ طبقہ کے ہاتھ میں رہا جو کمزور صوبوں کے عوام کو اپنی نوآبادی بنا کر رکھنا چاہتا تھا۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ کے:

"پاکستان میں بعض لسانی کانفرنسیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کے صرف دو مقاصد ہوتے ہیں:

اوّل یہ کہ پاکستانی زبانوں کو آپس میں لڑاؤ۔

دوم یہ کہ اس لڑائی کے سائے میں انگریزی کو محفوظ کرتے جاؤ"

انہوں نے یہ بھی کہا کہ:

"پہلے انگریزی کی بے جا بالادستی کو ختم کریں اس کے بعد آپ خود دیکھ لیں گے کہ پاکستانی زبانوں میں قابلِ رشک مفاہمت خود بخود پیدا ہو جائے گی۔"

خواجہ ناظم الدین نے اپریل ۱۹۵۱ء میں انجمن ترقی اردو پاکستان (کراچی) کا افتتاح کرتے ہوئے اردو زبان کے بارے میں کہا کہ میری نظر میں اردو کی ایک "اپنی خوبی یہ ہے کہ وہ پاکستان کے کسی صوبے کی زبان نہیں اور سب کی زبان ہے اپنی ایسی خوبی کے سبب یہ واحد زبان ہے جو پاکستان کے مختلف حصوں میں مشترک ہے۔" اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر اردو

زبان مسلمانوں کی مشترکہ تہذیب وثقافت کی امین تھی اور آزادی کی تحریک میں اسلامی وحدت کا نشان بن کر ابھری تو آزادی کے بعد وہ کون سی قوتیں تھیں جنھوں نے اردو زبان اور پاکستان کی دیگر زبانوں کے درمیان وہی حکمت عملی اختیار کی جو استعماری قوتوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ جدوجہد ختم کرنے اختیار کی تھی۔

اس سوال کا جواب ڈاکٹر سید عبداللہ کی اس بات میں تلاش کیا جا سکتا ہے کہ ملک کا سب سے بڑا لسانی مسئلہ یہ ہے کہ:

"انگریزی زبان بلا جواز تمام کاروبار زندگی پر غالب ہے۔ یہ اس کا ناجائز غلبہ ہے جس نے ہمارے یہاں لسانی مسئلہ پیدا کیا ہوا ہے۔"

کہا یہ جاتا ہے کہ انگریزی کے بغیر کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی۔ یہاں اگر صرف جاپانی قوم کو دیکھا جائے جس نے اپنی قومی زبان میں تعلیم دے کر صرف افرادی قوت کے ذریعہ پوری دنیا میں ترقی کی مثال قائم کی، تو یہ بات غلط ثابت ہو جاتی ہے۔ اگر تمام ترقی یافتہ اقوام کو نظر انداز کر کے، جنھوں نے انگریزی کی بجائے اپنی قومی زبانوں میں تعلیم دے کر ترقی پائی۔ تھوڑی دیر کے لیے اس بات کو تسلیم کر بھی لیا جائے کہ انگریزی میں تعلیم حاصل کیے بغیر ترقی ممکن نہیں تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پاکستان بننے کے بعد عوامی سطح پر ایسا تعلیمی نظام کیوں رائج نہیں کیا گیا جس کے ذریعہ پوری قوم انگریزی کی ماہر ہو جاتی اور وہ کون لوگ تھے جنھوں نے برصغیر میں غیر ملکی تسلط کے دوران اپنی قوم کے ساتھ ہمدردی کرنے کی بجائے استعماری قوتوں کی مدد کی اور جاگیریں حاصل کیں۔ اور آزادی کے بعد پورے ملک میں اچھے اسکول قائم کرنے کے بجائے اپنے بچوں کو یورپی ممالک میں بھیج کر تعلیم دلوائی یا ان اسکولوں میں پڑھوایا جہاں عام آدمی کے بچوں کی رسائی ممکن نہیں تھی۔ اور انگریزی زبان کو تعلیمی اور سرکاری سطح پر محض اس لیے مسلط رکھا کہ یہی وہ دیوار تھی جس کے ذریعہ ۹۸ فیصد لوگوں کی ذہانت کا راستہ روک کر ان کے بچے نسل در نسل حکمران عہدوں پر فائز ہوتے رہیں۔ لیکن غور کریں کہ وہ بچے جن کی تعلیم وتربیت اپنے ملک وقوم سے دور ایسے ماحول میں ہوئی ہو جہاں رہ کر وہ ان مسائل اور ماحول سے یکسر بے خبر ہوں جن سے ملک کا ۹۸ فیصد طبقہ نبرد آزما ہو، جنھوں نے زندگی کو ترقی یافتہ ممالک کی چمک دمک اور پیسے کی فراوانی میں دیکھا ہو وہ ۱۵، ۱۶ کروڑ عوام کے دکھ درد اور مسائل کو کیسے سمجھ سکتے ہیں؟ یہی وہ لوگ تھے جنھوں نے طبقاتی نظام تعلیم رائج کیا۔ تا کہ غریب عوام کے بچے ذہانت سے مالا مال ہونے کے باوجود امراء کے بچوں کے سامنے احساس کمتری کا شکار رہیں۔

میں ۳۲ سال سے بلوچستان یونیورسٹی میں درس وتدریس کے شعبے سے وابستہ ہوں۔ ان ۳۲ برسوں میں علمی سطح پر نئی جنریشن کی اکثریت کو آگے بڑھنے کی بجائے تنزلی کا شکار ہوتے دیکھا ہے، جو اسکول اور کالج سے گزرتی ہوئی یونیورسٹی تک پہنچتی ہے۔ اس تنزلی کے ذمہ دار وہ اساتذہ بھی ہیں جو اسی زوال آمادہ تعلیمی نظام سے نکل کر سیاسی وابستگی کے سبب تعلیمی اداروں میں منتخب کیے جاتے ہیں۔ فطری اصولوں کے مطابق انسانی زندگی، بتدریج ارتقائی عمل سے گزرتی ہے۔ غار کے عہد سے لے کر چاند تک رسائی کا مرحلہ اسی عمل کا حصہ ہے لیکن پاکستان نے مذکورہ حقائق کے سبب بتدریج زوال کی سمت سفر کیا۔ اس کی بنیادی وجہ وہ غیر فطری طریقۂ تعلیم تھا جو لارڈ میکالے نے ہمیں Truly dominated قوم بنانے کے لیے استعمال کیا تھا۔ ایک ایسی زبان جس کی جڑیں اس ملک کی تہذیب وثقافت، یہاں کی مٹی آب وہوا جغرافیائی حالات یا مزاج سے ہم آہنگ نہ ہو۔ اس کو جبراً مسلط کرنے کا

نتیجہ یہ ہوا کہ آزادی کے بعد سے آج تک ہم صرف اور صرف انگریزی سیکھ رہے ہیں۔ پاکستان میں Spoken English ایک ایسا ”خوبصورت اوورکوٹ“ ہے جس نے علمی مفلسی کو چھپا رکھا ہے اور اکثریت ایسی تعلیم حاصل کر رہی ہے جس میں تحقیق اور تخلیق نا پید ہے۔ جہاں تک ادب کا تعلق ہے، ادب قومی زندگی اور قومی تہذیب و تمدن کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ بی۔اے کی سطح پر اسے خارج کر کے بچوں کو انگریزی ادب پڑھایا جانے لگا۔ ہمارے نوجوان جس زندگی اور جن تجربات اور مشاہدات سے گزر رہے ہیں، تعلیمی تناظر میں وہ ایک دوسری زندگی کا مطالعہ اور مشاہدہ کرنے پر مجبور ہیں جو اخلاقی، مذہبی اور جغرافیائی سطح پر قطعی مختلف تہذیب و تمدن رکھتی ہے۔ یہی وہ تعلیم ہے جس نے علم کی روشنی پھیلانے کے بجائے قول و فعل کے تضاد کو جنم دے کر نئی نسل کو انتشار اور بے سمتی کا تحفہ دیا جس نے قومی یکجہتی کو پروان چڑھنے دیا اور نہ آج تک ہماری کوئی ایسی اجتماعی شناخت بن سکی جو کسی معزز قوم کا طرہ امتیاز ہوا کرتی ہے۔ یہی وہ بے سمتی اور انتشار تھا جس نے اس ملک میں جمہوریت کو اس کی اصل روح کے ساتھ پنپنے نہیں دیا۔ یہی وہ ماحول تھا جس میں سیاست بھی ایک تجارت بن گئی۔ کروڑوں روپے خرچ کر کے منتخب ہونے والے رہنما قومی خزانے سے اربوں روپے لوٹنے یا دوسرے لفظوں میں ”کمانے“ کو اپنا حق سمجھتے رہے۔ اس نظامِ تعلیم نے قومی کردار تشکیل دینے کی بجائے خود غرضی کو پروان چڑھایا اور ایک ایسے ماحول کی پرورش ہوئی جس میں Spoken English قابلیت کی معراج قرار پائی۔ ذہانت قابلیت اور خداداد صلاحیتیں بے توقیر ہو کر رہ گئیں ان حالات میں جنم لینے والی جہالت کے خوفناک عفریت نے کرپشن کو فروغ دیا۔ یہ بھی ایک قسم کی دہشت گردی تھی جس کے ذریعے نااہل افراد بڑے بڑے عہدوں پر براجمان ہوئے۔ خود غرضی اقربا پروری اور ذاتی مفادات کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا جس نے قومی یک جہتی اور ملک سے محبت کے اس تصور کو جڑ سے اکھاڑ دیا جو کسی معتبر قوم کا فخریہ نشان ہوتا ہے۔

ہو سکتا ہے کچھ لوگوں کو میری باتوں میں جذباتیت کا عنصر نظر آئے ان کے ذہن میں وہ نوجوان طبقہ ہو جس نے نامساعد حالات بھی نہ صرف علم کی آبرو برقرار رکھی بلکہ ملک و قوم کی خدمت بھی کر رہے ہیں۔ یہ بات درست ہے لیکن اس وقت میری فکر کا محور اکثریت کے مسائل ہیں۔ تاہم یہاں H.E.C کا تذکرہ ضروری ہے۔ جس کی کوششوں نے پورے ملک میں پھیلے ہوئے ان بھاری پتھروں کو ہٹانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ”جو اوورکوٹ“ میں چھپی نااہلی نے ذہانت اور صلاحیتوں کے راستے میں بچھا رکھے تھے۔ ویب سائیٹ، اخبارات، رسائل اور دیگر ذرائع سے اتنے دروازے کھول دیے کہ قابلیت اور صلاحیتوں کے راستے میں شاید کوئی منفی قوت اب حائل نہیں ہو سکتی۔ لیجر زی نیشنل کانفرنس میں ڈاکٹر عطا الرحمٰن نے کہا تھا کہ:

> "There is no greater pleasure then acquiring Knowledge and Educating others."

یہ بہت بڑا جملہ ہے۔ یہ انسانی زندگی اور علم دونوں سے محبت کیے بغیر ادا نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس Greater Pleasure میں کئی گنا اضافہ ہو سکتا ہے اگر H.E.C میں چھپنے والے معلوماتی لٹریچر کا اردو Version بھی شروع کرا دیا جائے۔ جس کے ذریعہ پورے ملک کی اس اکثریت کو بھی اپنی ذہانت Share کرنے کا موقع ملے گا جو بوجوہ انگریزی میں زیادہ مہارت نہیں رکھتی۔

سرکاری دفاتر میں انگریزی کے سبب پاکستانی عوام کی اکثریت کو جن تکالیف کا سامنا ہے، انھیں دور کرنے اور ان کی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے مذکورہ حقائق کے ساتھ یہ وضاحت ضروری ہے کہ دفتری زبان اردو ہونی چاہیے۔ جس کے ساتھ ذریعہ تعلیم اور عدالت کی زبان کی تبدیلی بھی ضروری ہے۔ کیونکہ یہ تینوں ادارے اجتماعی عوامی رشتوں میں جڑے ہوئے ہیں۔

قائداعظم کے فرمان اور آئین کی رو سے پاکستان کی قومی اور سرکاری زبان اردو ہے۔ صدر پاکستان ایک آرڈیننس کے ذریعے کسی مقررہ تاریخ سے اس کے نفاذ کا اعلان کر سکتے ہیں جس میں ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وقتی طور پر سرکاری کاروبار میں اردو اور انگلش دونوں Version استعمال کیے جائیں۔

۱۔ اردو کالج بورڈ کراچی۔ ۲۔ سائنٹفک سوسائٹی کراچی۔ ۳۔ مجلس ترقی ادب لاہور۔ ۴۔ ترقی اردو بورڈ۔ ۵۔ مرکزی اردو بورڈ اور دیگر ایسے علمی ادبی اداروں نے جدید علوم و فنون کے تراجم اور اصطلاحات سازی کے لیے گراں قدر کام کیا ہوا ہے، جس کے سبب اردو کو سرکاری زبان کی حیثیت سے کوئی دشواری پیش نہیں آ سکتی۔ اس کے علاوہ ۱۹۷۹ء میں قائم کردہ مقتدرہ قومی زبان نے اردو کو تعلیمی عدالتی اور سرکاری زبان بنانے کے لیے اردو کی ترقی اور ترویج سے متعلقہ تمام علمی اداروں کے تعاون سے اپنی قومی ذمہ داریوں کو بطریق احسن سرانجام دیا اور اردو کو اس قابل بنا دیا ہے کہ وہ سرکاری دفاتر میں انگریزی کی جگہ لے سکے۔ خود مقتدرہ قومی زبان میں تمام علمی اور سرکاری کام اردو میں ہوتا ہے اور کسی قسم کی دشواری پیش نہیں آتی۔ اور اگر کسی کام کے آغاز میں کوئی اتفاقی دشواری پیش آئے بھی تو ترقی اور تبدیلی کا ارتقائی عمل ان مشکلات کو از خود دور کرتا رہتا ہے۔ سولھویں صدی عیسوی میں لاطینی اور فرانسیسی کے مقابلے میں انگریزی ایک غیر اہم زبان تھی۔ انگلستان کے حب الوطن اہل علم اپنی زبان انگریزی کو جو لندن کے شہر کی مقامی بولیوں سے پیدا ہوئی تھی اس کو سرکاری اور علمی زبان بنانا چاہتے تھے اور جب وہ انگریزی کو علمی اور سرکاری زبان بنانے میں کامیاب ہو گئے تو نہ صرف انھوں نے تیزی سے علمی مراحل طے کیے بلکہ انگریزی آج ایک بین الاقوامی زبان بن چکی ہے، جس میں لاطینی اور فرانسیسی اصطلاحیں اب بھی شامل ہیں۔ اردو زبان بھی برصغیر میں بولی جانے والی بولیوں سے پیدا ہوئی ہے۔ اس کو سرکاری اور علمی زبان کے طور پر رائج کرتے وقت اس میں وہ انگریزی اصطلاحات شامل کی جا سکتی ہیں جو عام فہم اور رائج ہیں۔ اردو زبان میں بھی انگریزی زبان کی طرح وسعت پذیر ہونے کی پوری صلاحیت ہے۔ لیکن بدقسمتی سے جب بھی قومی مفاد اور علمی ترقی کے لیے اس کو تعلیمی زبان بنانے کی کوشش کی گئی تو بعض سماج دشمن عناصر نے اس میں انگریزی کی اصطلاحوں کے عربی تراجم اور دیگر زبانوں کے غیر مانوس اور ثقیل الفاظ کی بھرمار اس طرح کی کہ اردو زبان کی شکل ہی بدل گئی۔ وہ گنجلک اور ناقابل فہم ہو کر رہ گئی۔ جس کے سبب طلبا کی اکثریت مزید Confusion کا شکار ہوئی۔

اس قسم کے تراجم بھی دراصل انھیں لوگوں نے کروائے جو انگریزوں کے چلے جانے کے بعد پاکستان کے عوام کو اپنی نوآبادی بنائے رکھنے کے لیے اردو کی شکل بگاڑ کر انگریزی کی سرپرستی کر رہے تھے۔ چین جو پاکستان کے بعد آزاد ہوا آج ترقی یافتہ ممالک کی صف میں کھڑا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے پوری قوم کا وقت انگریزی سیکھنے میں ضائع نہیں کیا بلکہ چند لوگوں کی بیرونی زبانوں سے واقفیت کو بروئے کار لا کر دوسری زبانوں کے علوم و فنون کو چینی زبان میں منتقل کرتے رہے جس کے سبب پوری

چینی قوم نے نہ صرف براہ راست ان علوم وفنون سے استفادہ کیا بلکہ چینی زبان کو بھی وسعت ملی۔

اس کے برعکس پاکستان میں ۶۰ سال صرف انگریزی سیکھنے اور سکھانے میں صرف کر دیے گئے جس کے سبب اکثریت کو نہ انگریزی آئی اور نہ علم کا حصول ممکن ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مغرب کی طرف سے آنے والی ہر نئی ٹیکنالوجی کی طرف اندھا دھند دوڑ کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔

مغربی اقوام ترقی کی جس منزل پر صدیوں کے علمی سفر کے بعد پہنچی تھیں ہم نے اس منزل کو صرف انگریزی زبان اپنا کر عبور کرنا چاہا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ترقی یافتہ اقوام اگر آج مشینی روبوٹ بنا رہی ہیں تو ہم انسان کو روبوٹ بنا کر خوش ہیں۔

بقول مولوی عبدالحق کے اصل بات یہ ہے کہ ''انگریزی حکومت میں بڑا ظلم یہ ہوا کہ ہمارے تعلیمی نظام میں انگریزی ذریعہ تعلیم قرار پائی اور ہماری زبان نصاب سے خارج کر دی گئی نتیجہ یہ ہوا کہ ہمیں انگریزی تعلیم سے فائدے کی نسبت نقصان بہت زیادہ پہنچا۔ اگر انگریزی بحیثیت زبان کے پڑھائی جاتی اور ہماری زبان ذریعہ تعلیم ہوتی تو انگریزی سے جو فوائد ہمیں اس وقت پہنچے ہیں وہ اس صورت میں بھی ہوتے اور ذریعہ تعلیم ہونے سے جو جسمانی، ذہنی اور اخلاقی نقصانات پہنچے ہیں ان سے محفوظ رہتے۔ بلکہ ایک فائدہ عظیم یہ ہوتا کہ اگر اردو ذریعہ تعلیم بنا دی جاتی اور تمام علوم اور زبانیں یہاں تک کہ انگریزی زبان بھی اس کے ذریعہ پڑھائی جاتی تو مغربی علوم وادب کے افکار و خیالات خود بہ خود ہماری زبان میں جذب ہوتے چلے جاتے اور علمی و ادبی اعتبار سے اس کا مرتبہ بہت بلند ہو جاتا اور وہ دنیا کی ترقی یافتہ علمی زبانوں کا مقابلہ کر سکتی اور ہماری قوم میں جہالت کا یہ عالم نہ ہوتا جواب ہے۔''

تاہم موجودہ دور میں یہ بات خوش آئند ہے کہ حکومت مختلف دیگر ترقیاتی ملکی امور کے ساتھ ذریعہ تعلیم اور سرکاری زبان جیسے انتہائی سنجیدہ مسئلے کی طرف بھی توجہ دے رہی ہے۔ یہاں گورنمنٹ کی طرف سے جاری کیے گئے White Paper of Education کا حوالہ بھی ضروری ہے جس میں تعلیم سطح پر ۹۰ فیصد عوام کی خداداد صلاحیتوں سے استفادہ کرنے اور ذریعہ تعلیم کے طور پر اردو کو اختیار کرنے کے لیے تین لازمی زبانوں کا فارمولا پیش کیا ہے۔

۱۔ پہلی لازمی زبان انگریزی ہے جو جدید علوم وفنون کے علاوہ بین الاقوامی زبان ہے۔ اس لیے قابل اساتذہ کی نگرانی میں انگریزی زبان سکھانے کے لیے پہلی کلاس سے اسے لازمی قرار دیا جا رہا ہے۔

۲۔ دوسری لازمی زبان اردو ہے جو قومی سطح پر عام فہم اور رابطے کی زبان ہونے کے علاوہ اتنی وسعت کی حامل ہے کہ تراجم کے ذریعہ جدید ترین علوم سیکھنے کا آسان ترین ذریعہ بن سکتی ہے۔

۳۔ تیسری لازمی زبان پاکستان کی دیگر زبانوں میں سے کوئی بھی ایک زبان لازمی ہوگی جس کا انتخاب طالب علم اپنی مرضی اور ضرورت کے مطابق کر سکے گا۔

White paper of Education کے مطابق Higer Level پر ذریعہ تعلیم انگریزی ہوگا۔ لیکن یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ وہ بچے جو اب پہلی جماعت سے انگریزی پڑھیں گے ان کے Higher Level پر آنے تک اگر ذریعہ تعلیم Higher Level پر بھی انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں رکھا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا تاکہ عوام کی اکثریت وہ ذریعہ

تعلیم اختیار کر سکے جس میں وہ سہولت محسوس کرے۔

قومی ترقی اور عوام کی آسانی کے لیے یہ طریقہ ایسا ہے جس کو پاکستان بننے کے فوراً بعد اختیار کیا جاتا تو چین کی طرح شاید آج پاکستان بھی ترقی یافتہ ممالک کی صف میں نظر آ سکتا تھا۔

ملکی ترقی کے لیے پوری قوم کی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لانا ضروری ہے جس کا واحد راستہ صرف وہی ہے جو سولھویں صدی عیسوی میں انگریز محب وطن اہل علم نے لندن شہر کی مقامی بولیوں سے پیدا ہونے والی زبان انگریزی کو سرکاری اور علمی زبان بنا کر اختیار کیا تھا۔

۱۔ اردو برصغیر کی مقامی بولیوں سے پیدا ہونے والی ایک ایسی زبان ہے جو نہ صرف مسلمانوں کی تہذیبی، ملی اور ثقافتی ورثے کی امین ہے بلکہ ہندی کے مقابلے میں تحریک پاکستان کی روح رواں اور اسلامی مملکت پاکستان کی اجتماعی شناخت بھی ہے۔

۲۔ یہ پاکستان کی واحد زبان ہے جو چاروں صوبوں میں یکساں طور پر سمجھی اور بولی جاتی ہے جس کے سبب اس کو علمی اور سرکاری زبان بنائے بغیر ترقی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

اگر ترقی کرنا ہمارا نصب العین ہے تو اردو کو علمی اور سرکاری زبان بنانا ہماری ضرورت ہے۔ اس ضرورت کو آج سمجھا جائے یا چند صدیاں اور گنوانے کے بعد؟

اس کا فیصلہ ہمارے اپنے ہاتھ میں ہے

کتابیات

۱۔ تحریک نفاذ اردو۔ ڈاکٹر سید عبداللہ۔ مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۵

۲۔ قومیت کی تشکیل اور اردو زبان۔ جیلانی کامران۔ ۱۹۹۲ء

۳۔ قومی زبان یک جہتی، نفاذ اور مسائل۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، ۱۹۸۹ء

۴۔ پاکستان کے تہذیبی مسائل۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی، ادارہ ادب و تنقید لاہور ۱۹۷۹ء

۵۔ اردو قومی یک جہتی اور پاکستان۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری۔ انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۹۲ء

۶۔ اردو نثر کاری منتخب مقالات۔ مرتب علی حیدر ملک۔ مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد ۱۹۸۹ء

۷۔ پاکستان میں اردو انگریزی تنازع کی تاریخ۔ ڈاکٹر طارق رحمٰن۔ مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۶ء

۸۔ منتخبات اخبار اردو۔ ڈاکٹر معین الدین عقیل۔ مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۸ء

۹۔ Education in Pakistan A white paper

۱۰۔ Lord Me Caulay in his speech of Feb,2, 1835 British Parliment
www.salagram.net.britih rag plan1835.ht ml

۱۱۔ News and Views H.E.C.2007

۱۲۔ محمد علی جناح۔ ہولائتھو۔ مترجم زبیر صدیقی۔ اردو سائنس بورڈ لاہور ۱۹۸۴ء

E:\makhzan\New Folder\5.jpg not found.

ڈاکٹر خاطر غزنوی

اردو اور علاقائی زبانیں

اردو کے بارے میں بہت سے محققین نے اپنی اپنی تحقیق کے حوالے سے اپنی رائے ظاہر کی ہے۔ڈاکٹر محی الدین زور قادری،ایس کے چیٹر جی، مسعود حسین خان، علامہ محمود شیرانی، ڈاکٹر گراہم بیلی، بلگرامی، جارج گریرسن، جان گلکرسٹ، ڈاکٹر شوکت سبزواری،سید سلیمان ندوی، فارغ بخاری، ڈاکٹر موہن سنگھ، ڈاکٹر بینی پرشاد وغیرہ۔

کچھ محققین اسے پنجابی سے پیدا ہونے والی زبان کہتے ہیں کچھ اسے کھڑی بولی یعنی دلی کی زبان کہتے ہیں۔ان محققین کی آرا، زبانوں کے محققین اور طلبا کے لیے ممد و معاون ثابت ہوں گی،ان ہی آرا میں پنجابی کے ساتھ ساتھ ہندکو زبان کو تذکرہ بھی ملتا ہے۔پنجابی اور ہندکو زبانوں میں کوئی بعد نہیں ملتا، بلکہ محسوس ہوتا ہے کہ دونوں زبانوں کا منبع ایک ہی ہے۔

ہم نے اس سے پیشتر ہندکو زبان کو "سندھکو" زبان کہا تھا،اس لیے کہ دریا کے کنارے گوجری زبان سے سندھی تک کے ڈانڈے مل کر بنتے ہیں ۔دریائے سندھ کے دونوں کناروں کی بولیاں یا زبانیں کسی قدر عالمی تصور کا مظہر ہیں یعنی ہر پندرہ کلومیٹر کے بعد دنیا کی سب زبانوں کا لہجہ کسی قدر تبدیل ہو جاتا ہے اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ ہزارہ یا پشاور یا کوہاٹ کے "ہندکووان" اگر ملتان، بہاول پور، کیتھران اور سکھر کے لوگوں سے اپنی اپنی بولی میں بات کریں تو سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی ۔چھچھ، پوٹھوہار، اٹک،کالا باغ،میانوالی، کھیتران اور سکھر دریائے سندھ کے کناروں کی بولیاں یا زبانیں ہیں۔اس سلسلے میں دریائے سندھ کے بارے میں تاریخ پشاور (۱۸۶۳ء) کے مؤلف رائے بہادر منشی گوپال داس لکھتے ہیں:

> "اس دریا سے مخلوقات کو نفع پہنچتا ہے یعنی اس کے واسطے سے لکڑی کوہستانی از قسم چیڑ (چیل) و دیار ہ نجگوڑہ کی طرف سے اس ضلع (اٹک) میں لا کر بیچی جاتی تھی اور اس سے ضلع کے سوداگر لوگ اکثر مال تجارتی کشتیوں پر رکھ کر بطرف ملک سکھر و بمبئی سے آگے تک لے جاتے تھے اور اس کے کنارے پر شہر اٹک (موجودہ ملاحی ٹولہ) میں عمدہ کشتیاں بنائی جاتی ہیں۔جن کو ساہوکاران شکار پور یہ و دیگر سوداگران بوقت ضرورت ارسال مال تجارتی جانب ملک سندھ بہت روپیہ کے عوض میں خرید تے ہیں اور محصول میر بحری سے منفعت سرکار و فائدہ قوم ملاح خود ظاہر ہے ۔چنانچہ سال حال میں مبلغ ......روپیہ سالانہ واجب الادا بذمہ

> ٹھیکہ داران گزرات منسوب ضلع ہذا مقرر ہے اور وہ دو گزر ہیں جن میں اول گزر اٹک ہے۔ اٹک جس سے یہ گزر منسوب ہے ایک قلعہ ہے سنگین بڑا وسیع اور مستحکم بنوایا ہوا ہے اکبر بادشاہ کا، جو شہر پشاور سے تیں کوس کے فاصلے پر جانب مشرق بکنار شرقی دریائے اٹک ہے۔ اٹک بزبان ہندی (ہندکو) ضلع پشاور ایک لفظ ہے جس کے معنی بزبان اردو "ٹھہر (رک جاؤ)" ہے کہ جب ۹۸۴ء میں اس بادشاہ کو سفر کابل پیش آیا تو جہاں پر یہ قلعہ ہے وہاں جوش و خروش آب دریا سے فرصت عبور نہ پا کر، چند روز ٹھہرا، پھر حکم بنانے قلعہ فرمایا اس واسطے عوام الناس نے اس قلعہ کو بایں نام موسوم کرایا۔"

یہ اقتباس مزید اس بات کی تائید کا ضامن ہے کہ دریائے سندھ نے سکھر اور بمبئی تک اس علاقے کے لوگوں کا ربط ضبط برقرار رکھا، گویا دریائے سندھ بحیرہ عرب کے راستوں سے مختلف علاقوں میں ہزارہ، پشاور اور اٹک کا سامان اور "زبان" پہنچاتا تھا۔ "زبان" یقیناً فاصلوں کو کم کرنے میں ممد ثابت ہوئی، یہ زبان کون سی تھی؟ ہم یہی بات زور دے کر کہنا چاہتے ہیں کہ یہ وادی سندھ کی زبان تھی، دریائے سندھ کی زبان تھی، دریائے سندھ کے کنارے آبادیوں کی زبان تھی جو آج تک یگانگت اور افہام و تفہیم کے بندھنوں میں بندھی ہوئی ہے۔ ان لوگوں کو ان کی زبان نے تجارت و معاشرت کے دائرے میں ایک دوسرے سے قریب رکھا ہے۔

اردو سے قرب کی داستان الگ ہے۔ اس کی تشکیل تو مغلوں کے عہد میں ترکی، عربی اور فارسی کے امتزاج سے ہوئی، اس کی بنیاد ہندی ہے، ہندی جو ہندکو کے الفاظ کو دیکھیں، سوچیں اور پرکھیں تو نتیجہ خود بخود یہی بتاتا ہے کہ یہ تہذیب ایک تھی اور یکساں تھی۔ دریائے سندھ کی تہذیب یعنی Indus Valley Civilization کا جائزہ لیں تو دریائے سندھ اس علاقے میں شمال سے جنوب تک کے رقبے میں شہ رگ کی طرح رواں دواں ہے اور تب اور آج کی تہذیب کو ہم آہنگ کیے رہا ہے۔

شمال میں گوجری زبان کا جائزہ لیں تو یہ اسّی فیصد اردو ہے۔ گوجری کے علاقے میں اردو کیسے پہنچی اور اثر انداز ہوئی بے معنی بات ہے۔ ہندکو، پنجابی اور ملتانی زبانیں ہندوستان جاتی رہی اور ہندی اور تشکیل شدہ اردو پر اثر انداز ہوتی رہیں۔

اس بات کا ایک ثبوت دکنی زبان ہے، دکنی ادب کی تاریخوں میں دو شعرا یعنی محمود اور فیروز کا ذکر ملتا ہے۔

محمود پٹھان تھا اور صوبہ سرحد سے دکن پہنچا، سرحد میں پٹھانوں میں ایک بات تقریباً ہر پشتو تاریخ میں ملتی ہے کہ پشتون روزی کی تلاش میں ہندوستان جاتے اور کہا کرتے، نوکری نہ ملی تو فوج کی سرداری تو مل جائے گی۔ ہندوستان کی ریاستیں ٹونک، بھوپال، رام پور، روہیل کھنڈ، یوپی، بارہ بستی، ملیح آباد، امروہہ میں پٹھانوں کی سرداری رہی۔ وہ کچھ اپنی، کچھ ہندی اور بعد میں تشکیل پانے والی مغل یا قلعہ معلی کی زبان پر اثر انداز ہوئے۔

محمود کے ہاں دکنی، پشتو، ملتانی اور فارسی زبانوں کی شاعری ملتی ہے، اس کی بیاض مولانا عبدالحق کی کوششوں سے دکن سے کراچی پہنچی جس کی ایک نقل راقم الحروف کے کتب خانے میں محفوظ ہے اس میں محمود یہاں کی رائج بحر:

فعلن فعل، فعول فعول فعلن، فعلن فعل فعول فعول فعلن

دکن لے گئے۔ یہ بحر وارث شاہ نے ہیر میں اور ہندکو شعرا نے حرفیوں میں استعمال کیں۔ محمود نے وہاں ایک نئی صنف شعر "جھولنے" کا اضافہ کیا جو ہیر کی بحر میں چار مصرعوں پر مشتمل ہے۔ ملاحظہ ہو:

دیکھ تن کے بال مور چنگ ہوئے ترے شوق میں آپ سوں بجتے ہیں
کل شے زمین آسمان میانے، رام رام رحیم کر بجھتے ہیں
اس چنگ مور چنگ کے باجے میں تری زلف کے تار سوجھتے ہیں
محمود پکار کے بولتا ہے عاشق وہ جو خود کو تجتے ہیں

دوسرا جھولنا ہے:

میرے دل کے حال کوئی کیا جانے تجھ بولتا ہوں تو سنتا نہیں
کبھی پھوڑتا ہوں سرود ڈھولک اپنا خود لکھیا ہوں آپ کا نہیں
کدھی ہنستا ہوں کدھی روتا ہوں کدھی دیکھتا پیو کو چومیا نہیں
خود چھوڑ محمود ایس کی باتوں کی تو اپی اپ ایس پچھانو جنئیں

ایک اور جھولنا

تیرے نین سدا ہیں مست لالہ میرے دل کوں مارے بے ہوش کئے
میرے حال کوں دیکھ بے حال ہوئے لوکاں دیکھ کے مجھ خروش کئے
دیکھو ہیر شہباز تک دیکھنے میں یاراں سب سکل مدہوش کئے
محمود دیکھ بجھاؤں دل منے تیرے جیو کو پیو ے نوش کئے

ایک اور جھولنا

وحدہٗ لا شریک ہم نہ بولیں کُل میں کل سمجھتے ہیں
کیوں شیخ باہمن چور سعد بنے کیوں غوث قطب ابجتے ہیں
عاشق جلوہ دیکھ ویران ہوئے ننگ لاج لوکاں کے تجتے ہیں
تن من اختیار محمود کا کر آپ کھ دیکھاونا بجھے ہیں

ان جھولوں میں موجود نے یہ ہندکو الفاظ استعمال کیے ہیں:

ہوائے، کدے، کدھی، آپی آپ، پچھاں، لوکاں آپے سعد، کھ بجھے ہندکو الفاظ ہیں ظاہر ہے ہندکو دکنی زبان پر اثر انداز ہوئی۔ دکنی زبان اردو کا کسی حد تک ماخذ ہے دکنی میں جمع کا صیغہ بھی ہندکو کے جمع کے صیغے کا نتیجہ ہے۔ مثلاً شمع (شمعاں) لوک (لوکاں)، روٹی (روٹیاں)، کانچ (کانچاں)، نوی (نویاں)، خبر (خبراں)، گل (گلاں)، مٹھی (مٹھیاں) وغیرہ۔

ہمارے اس دعوے کی تصدیق مرحوم ڈاکٹر محی الدین زور قادری ان الفاظ میں کرتے ہیں۔ ان کا قول سارے جھگڑے کو ختم کر دیتا ہے۔

"موجودہ زمانے میں یہ بتانا مشکل ہے کہ کس ٹھیک ٹھیک وقت سے پنجاب کی اور نواح دہلی کی زبان میں فرق پیدا ہونے لگا۔ یقین ہے کہ فرق مسلمانوں کے قبضہ دہلی کے بعد شروع ہوا ہے، ابتدا میں وہ صرف ایک تدریجی تغیر ہوگا مگر آخر کار ان دونوں مقامات کی بولیں کے درمیان ایک ایسا خلیج حائل ہوتا گیا کہ ایک پنجابی بن گئی اور دوسری کھڑی بولی۔

اردو نہ تو پنجابی سے مشتق ہے اور نہ کھڑی بولی سے بلکہ اس زبان سے جو ان دونوں کی مشترک سرچشمہ تھی اور یہی وجہ ہے کہ بعض باتوں میں پنجابی سے مشابہ ہے اور بعض میں کھڑی بولی سے۔"

اور پھر ڈاکٹر زور ہی کا یہ تجزیہ ہمارے ہندکو کے دکنی زبان پر حاوی ہونے کی تصدیق کرتا ہے۔ ڈاکٹر زور نے "پنجابی" کا لفظ استعمال کیا ہے یہ لفظ "پنجاب" مسلمانوں کی آمد کے بعد اسے پانچ دریاؤں کی سرزمین کے حوالے سے پنج آب کہا گیا۔

اس سے پیشتر شہروں کے ناموں پر زبان کا تذکرہ ہوتا تھا۔ مثلاً ملتانی، لاہوری، پشوری، ہزارے وال، ڈیرے وال کہا جاتا، اس سلسلے میں دکن کے محمود کی بیاض کا تذکرہ ہو چکا ہے اس نے "ملتانی" زبان میں بھی شاعری کی اور اسے "ملتانی" کا نام دیا۔ کہنے سے مراد یہ ہے کہ پنجابی، ملتانی (موجودہ سرائیکی) لاہوری اور پشوری زبانیں دریائے سندھ کے کناروں کی زبانیں تھیں، انہیں ہم "سندھ کو" یعنی دریائے سندھ کی زبانیں کہتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ یہ زبان صدیوں سے قائم و رائج ہے۔ اس کا ثبوت ۴۰ عیسوی کے اس کتبے سے ملتا ہے جو آرا کے مقام پر ایک کنواں کھدوا کر ایک پشاوری نے نصب کیا تھا۔ اور جو اب لاہور کے عجائب گھر میں موجود ہے۔

اس کتبے کا تذکرہ ڈاکٹر سیف الرحمٰن ڈار نے اپنے مقالے Epigraphical Evidences from Taxila اور ڈاکٹر اے ایچ دانی نے اپنی کتاب The Peshawar میں کیا ہے۔

یہ کتبہ میری کتاب اردو کا ماخذ ہندکو میں موجود ہے اور اس کی مکمل تشریح بھی کی گئی ہے، یہ کتبہ اس لیے بھی اہم ہے کہ اس میں پشاور کا ذکر ہے اور اس میں تاریخ بھی کندہ ہے اور نصب کرنے کی وجہ تسمیہ بھی دی گئی ہے سب سے بڑھ کر یہ کتبہ ایسا ثبوت پیش کرتا ہے جس سے پہلی صدی عیسوی کی ابتدا میں رواج کا پتہ چلتا ہے۔

یہ کتبہ خروشتی رسم الخط میں ہے ڈاکٹر ڈار ٹیکسلا کے سلسلے میں یہاں پر حکومت کرنے والوں ان کے مذاہب، تہذیب اور تحریروں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ٹیکسلا کی تاریخ بڑی قدیم ہے اور اس نے بہت سی حکومتوں اور خاندانوں کی راجدھانیاں دیکھیں، جن میں ہخامنشی (ایرانی) یونانی، موریا، ستھین (ساکا یا شک) پارتھی کشان، ساسانی اور ان کے بعد سفید ہن تک بھی شامل ہیں۔ یہ حکومتیں اپنی مختلف

نسلوں کی وجہ سے الگ مذاہب، رسم و رواج اور استعمال میں ہونے والی مختلف تحریریں یا رسم الخط جو ان کی زبانوں کے ترجمان تھے اپنی الگ تہذیبوں کی نمائندگی کرتی تھیں یہاں کا سب سے پرانا رسم الخط ایرانی دستیاب ہے۔ یہ سامی الاصل تھا اور دائیں سے بائیں لکھا جاتا تھا، یہ اس سرزمین پر بہت پہلے متعارف ہوا، تمام ہخامنشی حکومت جس میں گندھارا اور ٹیکسلا شامل ہیں، ایک لنگوافرینکا یعنی سب سے مشترک طور پر استعمال ہوتی۔ ایک طویل مدت تک اس رسم الخط کے استعمال کے نتیجے کے طور پر اس سے ایک نئے رسم الخط کا آغاز ہوا جسے ہم خروشتی کہتے ہیں۔

یونانیوں نے گندھارا اور پنجاب کے علاقوں میں یونانی رسم الخط کو رواج دینے کی کوشش کی جس کے کندہ نمونے افغانستان کے بعض حصوں اور گندھارا میں پائے جاتے ہیں۔ یہ نمونے خصوصاً ٹیکسلا میں بھی ملے ہیں لیکن سکوں پر اس رسم الخط کو بھی استعمال کیا گیا۔ ٹیکسلا میں برہمنی رسم الخط کا رواج بھی رہا۔

یہ کتبہ ہند کو کی دو ہزار سال پہلے کی موجودگی پر صاد ہے۔

اب آیئے خروشتی زبان کا وہ کتبہ ملاحظہ کیجیے جو ٹیکسلا میں ایک کنواں تعمیر کر کے اس پر لگایا گیا تھا۔ یہ کتبہ ٹیکسلا کے قریب آرا کے مقام سے دستیاب ہوا۔

اب متن کی صوتی تصویر ملاحظہ ہو:

متن کا انگریزی ترجمہ:

"During the reign of the Maharaja, Devaputra, Kaisara Kanishka, the son of Vajheshka, in the forty first year 41 on the 25th day of the month Jyaishtha, this well was dug by Dashavhara, of the peshawarian scions, in honour of his mother and father, for the benefit of himself with his wife and

son, for the welfare of all beings in the (various) births. And, having written this (might there) for me---"

آ یئے اب اس دو ہزار سالہ قدیم تاریخی اور غیر معمولی تحریر کا تجزیہ کریں۔ اس کتبے کی خواندگی اردو رسم الخط کے تحت یوں ہوگی:۔

"مہاراجاس، راجاترا جاس، دیو پتراس، قیصراس، وجیش، کا پتراس، کنشکا س، سمبت سرا اکاچیاری سائی سم ۴۰ ۱۲ (۴۱) جیتھس ماساس دی ۲۰ ۴ ۱ ۱ اے دیواس کشونامی کھڈے کوپے وش دھرانیا "پوشاپوریا" پترانا ماترا پترانا پویائے آتمانس سجاریاس پتراس انوگرا ہارتھائی سروا ساپن جتی شو ہتائے اے ہوچالکھیا مے دھاما......"

اب اس عبارت کا لفظ بلفظ ترجمہ ملاحظہ ہو:

"بڑا راجہ ہے، تین پشتوں سے راجا ہے، دیوتا کا بیٹا ہے، قیصر ہے، وہ وجیش کا بیٹا ہے، کنشک ہے (جس کے دور حکومت کے) اکتالیسویں سال کے جیٹھ کے مہینے کے پچیسویں دن کھدوایا یہ کنواں داس وہار نے، جو پرشاپور (پشاور) کا فرزند ہے۔ ماں باپ (روحوں) کے لیے تحفے کے طور پر، اپنے فائدے (نجات) کے ساتھ اپنی بیوی اور بیٹے کے لیے اور بہو کے لیے سب کی۔ ان کے سب جنموں کے لیے...... یہ لکھ دیا (شاید وہاں) میرے......"

اب دیکھیے وہ اہم الفاظ جو اس کتبے میں درج ہیں:

ان میں سے اکثر الفاظ کم از کم یا بلاقطع و برید ہندکو زبان کے ہیں مثلاً مہاراجہ، راجہ، تراجہ، پتر، اکاچیاری (اکتالی)، جیٹھ، ماس، کھڈے، پشو پور، ماتا، پتا، آتما، سپتر، سرواساپن، اے میں چالکھیا۔

ان الفاظ کے پس منظر کے طور پر اس کے پہلے لفظ راجہ کا اس سے پیشتر رگ وید کے حوالے سے ذکر ہو چکا ہے۔

"اس داس قوم کے سربراہ راجہ کہلاتے ہیں۔" (رگ وید ۴/۴)

یہاں یہ بات کوئی دلیل دیئے بغیر مکمل سامنے آتی ہے کہ رگ وید میں آریا خود یہ تسلیم کرتے ہیں کہ لفظ راجہ برصغیر کے قدیم لوگ (منڈا اور دراوڑ) اپنے ملکی سربراہوں کے لیے استعمال کرتے تھے مہا کے لفظ کا آریوں نے اضافہ کیا اور مہاراجہ، شہنشاہ، بادشاہوں کا بادشاہ کے لیے گھڑا گیا اور "مہا" وہ جذبہ افتخار ہے جو آریا اپنی گھٹی میں لے کر آئے تھے۔

یہ حقیقت نہیں بھولنی چاہیے کہ جب آریا شمال مغرب کی جانب سے ہندوستان میں داخل ہوئے تو وہ بادشاہ راجاؤں کی طرح یلغار کرتے ہوئے نہیں آئے۔ راجہ یا کسی سرزمین کے سربراہ کا تصور انہیں ہندوستان کے اصل باشندوں سے حاصل ہوا۔ راجہ تراجہ کا مفہوم نسل در نسل یعنی تیسری نسل کا ہے تراجا یعنی تیسرا راجا، کنشک کشان خاندان کا سب سے نامور اور ذیشان مہاراجہ تھا

کشان خاندان کے پہلے راجہ کوجولا کڈفیسز جو ساکا قبیلہ کے یوے چی کے اہم قبیلے کشان سے تعلق رکھتا تھا جس نے باختر سے ساکا خاندان کے یوکر سے سائیڈس قبیلے کے آخری شہزادے ہرمیس کو شکست دے کر نکالا اور اپنی بادشاہت کو گندھارا تک وسعت دی جبکہ اس کی گدی پر براجمان ہونے والے نے یہ راج دھانی پنجاب بلکہ دریائے گنگا کی وادی تک پھیلا دی۔کشان اس خاندان کا تیسرا راجہ تھا۔جسے اس کتبے میں تراجہ کا نام دیا گیا۔

پُتراب بھی ہندکو زبان میں بیٹے کو کہتے ہیں۔

قیصر اس دور میں ایران کے شہنشاہوں کا لقب تھا، جو تاریخ کا حصہ ہے۔چونکہ ہخامنشی دور میں برصغیر کا بہت سا علاقہ ایرانیوں کے زیر تسلط رہا اس لیے یہاں راجہ کی تعریف اور بڑائی اور شان وشوکت کو قیصر سے تشبیہ دی جاتی، آج بھی اس علاقے میں ایران کے ان بادشاہوں کے لیے قیصر و کسریٰ لفظ استعمال ہوتا ہے۔

ست یا سمبت (سموت) آج بھی ہندوؤں کی تقویم کا لفظ ہے اور سن یا تاریخ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

اکثر محقق اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ ہندکو پنجابی زبان کی ایک شاخ یا حصہ ہے اور ان دونوں پر ہندی زبان کا گہرا اثر ہے۔حقیقت یہ ہے کہ ہندی ہندوستان کے مختلف علاقوں میں بولی جانے والی عوامی پراکرتوں یا زبانوں کی ترقی یافتہ صورت ہے۔ محققوں نے اس زبان کی چھان بین کر کے اس کے بارے میں بہت سی اہم باتیں سامنے لانے کی سعی کی ہے۔ان میں اس زبان کے مختلف علاقوں میں مروج لہجوں کا ذکر بھی شامل ہے۔انہوں نے اس سلسلے میں تفصیلی بحث کی ہے چنانچہ اس ضمن میں ہندی ادب کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر ایس کے چیٹر جی نے اس پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔وہ کہتے ہیں:

ہندی ادب سے مراد وہ تخلیقات کا پلندہ ہے جو مندرجہ ذیل زبانوں اور لہجوں یا بولیوں میں پایا جاتا ہے:

(۱) جدید نثری اور شعری ادب جو اٹھارویں صدی کے آخر میں شروع ہوا اور وسیع پیمانے پر کھڑی بولی کی صورت میں، جو دہلی کی معیاری زبان ہے، تخلیق ہوا اور مکمل ادبی لہر کی صورت میں انیسویں صدی کے وسط میں داخل ہوا۔

(۲) ابتدائی اور جدید ادب جو مغربی ہندی گروہ کا ترجمان ہے اور برج بھاشا اور بندیلی کی صورت میں عیاں ہے۔ ۱۳۰۰ء سے ۱۸۰۰ء تک بھاشا کا ادب باقاعدہ ہندی ادب کے طور پر رائج رہا اور اس میں سورداس، بہاری اور بھوشن جیسے عظیم شاعروں نے برج کی بولی میں شاعری کی۔

مندرجہ بالا ہندی کی دو صورتوں کے ساتھ ساتھ، جو قواعد کے لحاظ سے ایک ہی گروہ کا حصہ ہیں، ذیل کی بولیوں کا ادب بھی ہندی کی ذیل میں آئے گا کیونکہ اس دور میں ہندی بولنے والوں نے اس زبان کو:

(ا) اپنی عام زندگی، تعلیم اور ادب کے طور پر استعمال کیا۔

(ب) برج بھاشا اور بندیلی کو بھی ذریعہ بنایا۔

(۳) اودھی بولی جو بگھیلی اور چھتیس گڑھی بولی سے مربوط ہے۔ابتدائی ہندی ادب کی دوسری تخلیقات کے علاوہ تلسی داس جیسے

مشہور شاعر کا کلام بھی اسی ابتدائی اودھی بولی میں شامل ہے۔

(۴) مختلف راجستھانی بولیاں خصوصی طور پر ابتدائی مارواڑی جسے ڈینگل کا نام دیا گیا مارواڑی میں مع دوسری راجستھانی بولیوں کی عمدہ نظمیں مثلاً ''ویلی''، ''کرشنا''، ''رکمنی ری''، ''ڈھولا''، ''مارو اروہا'' اور کئی دوسرے نغماتی شعری نمونے ملتے ہیں۔ان کو بھی ہندی زبان کا حصہ کہا گیا ہے۔میرابائی کے بھجن جو بنیادی طور پر خالص راجستھانی بولی میں لکھے گئے ہیں لیکن بعد میں انہیں برج بھاشا اور کھڑی کا رنگ دے دیا گیا انہیں ہندی ادب کا قابل قدر حصہ سمجھا جاتا ہے، لیکن یہ امر ملحوظ خاطر رہے کہ راجستھانی بولنے والوں خصوصاً مارواڑی علاقوں میں یہ تحریک زور پکڑ گئی ہے کہ راجستھانی کو ہندی سے مختلف ایک الگ منفرد زبان سمجھا جائے۔

(۵) ملی جلی پنجابی (جس میں مشرقی اور مغربی پنجابی شامل ہے) اور مغربی ہندی (دہلی کی کھڑی بولی اور برج بھاشا بھی) کے بھجن اور سکھ گوروؤں کی تخلیقات کو بھی ابتدائی ہندی کہا جانے لگا۔

(۶) پہاڑی (مغربی پہاڑی اور مرکزی پہاڑی) کے چند شعر پاروں کو بھی ہندی ہی میں شمار کیا جانے لگا۔

اس طرح میتھیلی بولی والوں نے اپنی زبان کی محکومی کو تسلیم کرنے سے انکار کر کے اپنی بولی کو الگ تسلیم کرانے پر زور دیا۔

اسی تسلسل میں چیٹر جی نے تو اردو کو بھی ہندی ادب کا حصہ کہہ دیا ہے۔وہ ہندی بولیوں کی مختلف صورتوں کا ذکر کرتے کرتے یہ ذومعنی فقرہ لکھ گئے ہیں:

> ''اردو ادب جس کی اپنی ایک منفرد تاریخ موجود ہے بڑی خوشی کے ساتھ ہندی ادب کا حصہ گردانی جائے گی کیونکہ اردو اور کھڑی بولی ہندی کی گرامر یکساں ہے، یوں اردو اور ہندی اس نقطہ نظر کے تحت ایک ہی زبان کے دو مختلف انداز ہیں، اردو کو مسلمان ہندی کہا جاتا ہے۔اگرچہ یہ بات درست ہے کہ لسانی صورت حال بہت سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے قابل قبول نہ ہوگی''۔
>
> (چیٹر جی، جدید ہندی زبان و ادب)

اس موقع پر ایک مرتبہ پھر ڈاکٹر محی الدین زور قادری کا یہ قول اس سارے قصے کو ختم کرنے اور اس بولی کا بول بالا کرنے کے لیے کافی ہوگا، جو وادی سندھ یا سندھ کے دونوں کناروں کے ساتھ ساتھ شمال سے بہتی ہوئی جنوب بلکہ بحیرہ عرب تک صدیوں سے پھیلی ہوئی ہے اور جسے سندھ کو یا سندھ کی زبان کہا جا سکتا ہے کہ:

موجودہ زمانے میں یہ بتانا مشکل ہے کہ کس ٹھیک ٹھیک وقت سے پنجاب کی اور نواح دہلی کی زبان میں فرق پیدا ہونے لگا۔یقین ہے کہ فرق مسلمانوں کے قبضہ دہلی کے بعد شروع ہوا ہے۔ابتدا میں وہ صرف ایک تدریجی تغیر ہوگا مگر آخر کار ان دونوں مقامات کو بولیوں کے درمیان ایک ایسا خلیج حائل ہوتا گیا کہ ایک پنجابی بن گئی اور دوسری کھڑی بولی۔

اردو نہ تو پنجابی سے مشتق ہے اور نہ کھڑی بولی سے بلکہ اس زبان سے جو ان دونوں کی مشترک سرچشمہ تھی اور یہی وجہ ہے کہ وہ بعض باتوں میں پنجابی سے مشابہ ہے اور بعض میں کھڑی سے۔

اور پھر ڈاکٹر زوری کا یہ تجزیہ ہمارے ہندکو کے دکنی زبان پر حاوی ہونے کی تصدیق کرتا ہے:

جب شمال کے مسلمانوں نے دکن پر حملہ کیا تو وہاں ان کے ساتھ وہی زبان گئی جو ابھی خام تھی اور جس پر نواح دہلی کی زبان کا پورا اثر نہیں پڑنے پایا تھا۔ یہ غیر پختہ زبان دکن میں پھیل گئی اور بالکل نئے انداز میں پرورش پانے لگی۔

ایک آخری بات:

اردو کی پیدائش اور اس کے ماخذ کے سلسلے میں بہت سے محققین نے اپنے اپنے نظریات کا اظہار کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اردو کی پیدائش کی حقیقت نظریات کے انبار تلے دب گئی۔ سب سے پہلے ہیورنلے نے برج بھاشا کا نظریہ پیش کیا، اس کی تقلید مولانا محمد حسین آزاد نے کی اور "آب حیات" میں اپنے نظریے کو ان الفاظ میں پیش کیا:

> "اتنی سی بات ہر شخص جانتا ہے کہ اردو برج بھاشا سے نکلی ہے اور برج بھاشا خاص ہندوستانی زبان ہے۔ لیکن وہ ایسی نہیں کہ دنیا کے پردے پر ہندوستان کے ساتھ آئی ہو۔ اس کی عمر آٹھ سو برس سے زیادہ نہیں ہے اور برج کا سبزہ زار اس کا وطن ہے۔ سنسکرت اور بھاشا کی مٹی سے اس کا پتلا بنا ہے۔"

اس نظریے کو ہم اس مقالے میں رد کرتے ہوئے یہ ثبوت پیش کر چکے ہیں کہ اردو کی بنا جس زبان پر استوار ہوئی وہ سنسکرت کے ورود سے بہت پہلے وادی سندھ کی وہ زبان ہے جو آج بھی اپنی تمام تر قدامت اور پائیداری کے زندہ ہے۔ رام بابو سکسینہ تاریخ ادب اردو میں اس نظریے کو رد کر چکے ہیں۔ پھر معین الدین دردائی نے اردو کی ابتدا کا شرف بہار کو بخشا۔ ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ نے فرمایا کہ اردو پوٹھوہار سے نکلی ہے۔ مختلف محققین کی بعد کی تحقیق نے بہار کا تصور باطل کر دیا ہے البتہ ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ بحد و بطور پر ہماری ہمنوائی کر رہے ہیں کہ پوٹھوہاری بھی دریائے سندھ کی ہندکو یا سندھکو کا ایک حصہ ہے۔

ڈاکٹر گراہم بیلی نے حافظ محمود شیرانی کو یہ تصور دیا کہ اردو پنجابی بولی کا ترقی یافتہ روپ ہے۔

اردو ۱۰۲۷ء کے لگ بھگ لاہور میں پیدا ہوئی۔ قدیم پنجابی اس کی ماں ہے برج سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ ہم ڈاکٹر بیلی کے ان الفاظ کو بطور خاص اہمیت دیتے ہیں کہ ان میں ہمارے نظریے کی تائید اور تفصیل موجود ہے۔ وہ کہتے ہیں:

> **"The changes produced in England by the coming of the Normans have probably been exaggerated, but there produced in Punjaby and Hindi by the Muslim Army. Apart from the incorporation of many loan words the influence was remarkably small. Those languages remained practically unchanged in their pronouns, verbs, numbers and grammatical system. The chief change was in vocabularly."**

انگلستان میں نارمنوں کے آنے سے جو تبدیلیاں رونما ہوئیں ان میں شاید لفظ آرائی کی گئی ہے لیکن مسلمان فوج پنجابی اور ہندی پر کم اثر انداز ہوگی۔ بہت سے الفاظ کے آجانے کے باوجود اثرات کمتر ثبت ہوئے۔ ان زبانوں میں عملی طور پر ضمائر، افعال، اعداد اور صرفی نحوی طریق سے کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ اہم تبدیلی محض ذخیرہ الفاظ تک محدود رہی۔

جان گلکرائسٹ کی اردو گرامر ایک بڑی اہم اور اردو کے سلسلے میں ایک بنیادی کوشش ہے۔ اگر محققین غور فرمائیں تو کیا یہ گرامر بنیادی طور پر پنجابی یا ہندکو زبان سے مستعار نہیں لی گئی؟

سید سلیمان ندوی 'نقوش سلیمانی'' میں اردو کا مولد سندھ کو قرار دیتے ہیں اور وہ بھی جزوی طور پر ہمارے نظریے کی تائید ہے۔

سید فارغ بخاری نے ہندکو کو اردو کا ماخذ کہہ تو دیا لیکن وہ وضاحت اور ٹھوس دلائل سے اس نظریے کی تکمیل میں ناکام رہا۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری میرٹھ تک محدود ہو کر رہ گئے۔

بعض دانشوروں کا خیال ہے کہ بقول جناب حافظ محمود شیرانی مرحوم اردو پنجابی زبان کی مرہون ہے۔ دراصل یہ مقالہ ہرگز پنجابی زبان کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش نہیں بلکہ یہ حقیقت ہے کہ پنجابی اور ہندکو کا رشتہ بہنوں کا ہے ماں بیٹی کا نہیں۔ یہی سندھ کو یعنی ہندکو اپنے وسیع تر دائرے میں اس سارے وسیع علاقے کی اس رائج زبان کا حصہ ہے جس کی بنیادوں پر پنجابی زبان بھی پھلی پھولی۔ اردو بھی اور ہندکو بھی، لیکن پنجابی اور ہندکو بلاشبہ اردو سے قدیم تر ہیں اور اس سارے علاقے کی اصل زبانیں ہیں جو دریائے سندھ کے دونوں کناروں اور اس سے مشرق کی جانب انبالہ تک رائج رہیں اور جن کے اثرات شمال مغرب کے لوگ برصغیر میں لے کر گئے بلکہ جنوبی ہند یا دکن تک پہنچے اور جن کی گونج آج بھی دکنی زبان و ادب کی تاریخ میں محققوں کو سوچنے پر مجبور کرتی رہی ہے کہ ان زبانوں کی حیرت انگیز مماثلت کا سبب کیا ہے۔

اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دریائے سندھ کے دونوں کناروں کی زبان دریائے سندھ کی وادی کی تہذیب اور تمدن کا حصہ اور حقیقی وارث ہے اور آریوں کی آمد سے پہلے سے برقرار ہے اور سنسکرت کی طرح اس پر مردہ زبان کا کوئی دور نہیں آیا۔ یہ قطعی طور پر ہند آرائی زبان نہیں۔ یہ وادی سندھ کی اولین زبان ہے اور خالصتاً سندھ کو، یا ہندکو ہے۔ ہندی بھی اس کی بیٹی ہے اور اردو بھی۔

E:\makhzan\New Folder\9.jpg not found.

ڈاکٹر شاہین مفتی

اردو انفارمیشن ٹیکنالوجی اور میڈیا

رابطوں کی دنیا میں
لفظ ہی وہ رستہ ہیں
جس پہ لوگ چلتے ہیں
حرف اور معنی کی
ریشمیں طنابوں پر
ہاتھ جب پھسلتے ہیں
ساتھ چھوٹ جاتا ہے
دور جا نکلتے ہیں

اجنبی جزیروں کے
بے یقین لوگوں میں
عمر بیت جاتی ہے
حرف اور معنی کے
رشتہ ہائے پیہم کا
کچھ سرا نہیں ملتا
لوٹنا بھی چاہیں تو
راستہ نہیں ملتا

ملکِ عزیز میں ساٹھ برس گزر جانے کے باوجود بھی اردو زبان کی مہاجرت اور مستقل آبادکاری کا مسئلہ طے نہیں ہو سکا، وہ اپنے پیچھے کیا چھوڑ آئی ہے اور مقامی طور پر اس کا کیا Status ہے اس ضمن میں ہمیشہ ایک مباحثہ بلکہ بلند آہنگ مناظرے کی کیفیت روا رکھی گئی ہے، ہندوستان کے درجنوں مسلم اقلیتی علاقوں سے آنے والے اپنے تہذیبی ورثے کا مدار اپنے روزمرہ اور محاورہ پر ہی رکھے ہوئے تھے بلکہ وہ اسے ایک سماجی دستاویز اور اسلوبیاتی کرشمہ سازی جانتے تھے، ترکِ وطنیت اور تکلیفِ ہجرت

نے انہیں جس "Civilization Shock" سے دوچار کیا تھا اس کے نتیجے میں ان کی داخلی اور نفسیاتی زندگی ہمیشہ ڈھمل اور غیر مرتب رہی، ان کی آواز ایک دوسرے کے لیے پہچان کا ذریعہ تھی اور ان کے رابطے کی زبان اقلیتی خاصیت کے عذاب میں گرفتار، چنانچہ وہ بہت عرصے تک اپنے آپ کو اپنی گزری ہوئی سماجیات اور اپنی لسانی بیگانگی کے علاقہ غیر میں محفوظ کیے بیٹھے رہے، مقامی زبانیں اور مقامی لوگ اس وجہ بیگانگی پر شرمندہ ہوتے رہے۔ تقسیم کے اس عائد کردہ المیاتی ڈرامے میں عذاب دربدری سہنے والوں کا ہیرو اور ولن ان کا گزرا ہوا کل تھا جسے وہ کبھی اپنی جنت گم گشتہ سمجھتے اور کبھی اپنی کربلا، وہ اپنے داخلی اور خارجی تصادمات سے دونیم تھے، ان کی آنکھیں پیچھے رہ جانے والی زندگی، اس کے رشتوں اور اس کے متعلقات پر لگی تھیں، ایک دکھائی گئی زندگی کا خواب ان کی پلکوں سے الجھا ہوا تھا اور پیروں پر بے یقینی کی گرد تھی۔ وہ شکایت کناں تھے۔

''مٹی کو یہاں پاؤں پکڑنا نہیں آتا''

ایسا نہیں کہ نئی زمین نے انہیں خوش آمدید نہیں کہا تھا اور ایسا بھی نہیں کہ ان کی توہین کی گئی تھی بلکہ وہ اس نئے ملک میں امور سلطنت چلانے والے تھے، انتظامی عہدوں پر جاگزیں تھے، وہ قیادت کے قوانین بنانے والوں میں شامل تھے۔ سٹاک مارکیٹ ان کی دسترس میں تھی، تعلیم و تربیت کی لگام ان کے ہاتھ میں تھی۔ وہ مذاہب و مسالک کے مشائخ تھے۔ انہیں انگریز حکومت کے دستورالعمل سے شناسائی تھی، ابلاغ عامہ پر ان کا قبضہ تھا۔ خبر میں، نظر میں، اذان سحر میں انہیں یکتائے روزگار سمجھا جا رہا تھا، نئے سفارتی تعلقات ان کے دم قدم سے فروغ پا رہے تھے لیکن مسافرت اور ہجرت کی کڑواہٹ ان کا پیچھا نہیں چھوڑ رہی تھی۔

نہ گئی تیرے غم کی سرداری

دل میں گو روز انقلاب آئے

نہ ملاقاتوں سے اجنبیت میں کمی آئی نہ ملبوسات سے خون کے دھبے دھلے، آگے چل کر یہی جذباتی مظلوک الحالی اور ذہنی خانماں بربادی ایک طرف تو خدا کی نئی بستی میں سماجی خدمات انجام دینے والی چھوٹی چھوٹی محلہ تنظیموں سے بڑے اور مرتب فاشسٹ گروہوں میں تبدیل ہوئی اور دوسری جانب بہتر معیار زندگی اور روزگار کی تلاش انہیں ان یورپی ممالک تک لے گئی جنہیں کبھی وہ اپنے تہذیبی نظام میں نفرت کی نگاہ سے دیکھ چکے تھے، ان کے ساتھ ہی ساتھ ان کی زبان جواب قومی زبان کا درجہ پا چکی تھی پاکستان کے سیاسی، سماجی، معاشی اور ابلاغی افق پر اپنی شناخت کے لیے کئی طرح کی تاریخی اور لسانی الجھنوں کا شکار ہوئی، ہندوستان کے قدیم علاقوں کی لشکری زبان، بازار و دربار کے تمام تر تجربوں کے باوجود اپنے لوگوں کے لیے بیگانہ محض رہی، اس کے تاریخی تناظر کی قسمت میں ہندی اردو تنازعہ اور اس کے معروضی حقائق کے ابجد کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ تقسیم کے وقت وہ ایک دھڑکتا ہوا دل تھی جو آگے چل کر ذہن جدید کا اضطراب بنی۔ پبلک اوپنین، پاپولر اسٹیٹس، سوشل ایکشن اور سوشل کنفرمیشن کے چکر میں سب سے پہلے اسے مذہبی قربان گاہ پر نثار کیا گیا، ایک بھاشا۔۔۔ دولکھاوٹ کی منصوبہ بندی تقسیم کا راز ہان کی ایک اور پیش بندی تھی ہندو زبان و ادب اور مسلمان زبان و ادب اپنی اپنی راہ لگے، اردو کے ہندوستانی رسم الخط اور پاکستانی رسم الخط (جو فارسی و عربی سے مناسبت رکھتا تھا) آوازوں کے مانوس مرکبات سمیت ایک تقسیم شدہ مکان کے ملبے پر رکھے ہوئے تھے۔

پاکستان میں نئے لسانی جغرافیے کے زیر اہتمام یہی مسلمان زبان پاکستانی عوام کے درمیان رابطے کی زبان تھی اور اسے مستقبل میں تعلیمی، صحافتی، دفتری، عسکری، کاروباری، سفارتی اور سرکاری زندگی کا مشترک ورثہ بھی بننا تھا، لیکن افسوس، اس کا

سمندری سفر زیادہ کامیاب نہ رہا اور بنگالی مومنین مذہبی یک جائی کے باوجود اسے اپنے دلوں میں جگہ نہ دے سکے اس طرح تحریک نفاذ اردو کی پہلی مربوط کوشش اپنوں کے ہاتھوں ایک بڑی شکست سے دوچار ہوئی۔

مغربی پاکستان جس کے زیادہ تر علاقے اپنی سرسبزی و شادابی اور ہموار میدانی علاقوں، دریاؤں اور دوسری پہاڑی و آبی گزرگاہوں کے باعث حملہ آوروں کی اوّلیں اقامت گاہ بنے رہے اسی مسلمان اردو کا پہلا مضبوط قلعہ تھا، جہاں وہ محفوظ و مامون بھی تھا اور اسے گرم دل محبت کرنے والوں کی رفاقت بھی حاصل تھی، یہیں وہ اپنے ذولسانی تجربوں سے ہمکنار ہوئی، شاید ایک زبان، ارادے اور محبت کی بھی ہوا کرتی ہے جو ذہن میں پنپنے والے خیالات کو بیک وقت desire box اور belief book میں تبدیل کرتی ہے۔ اردو کے اس نئے اسٹیشن پر کچھ دیر کے لیے اعتماد اور اطمینان کا اظہار کیا گیا، وہ ابلاغ اور تعلیم کے درجے پر فائز ہوئی۔ سندھی، بلوچی، سرائیکی، پشتو، کشمیری، گوجری اور دیگر مقامی زبانوں سے بعض مقامات پر آوازوں اور بعض مقامات پر رسم الخط کے باعث یہ خیال تھا کہ آنے والے کچھ برسوں میں یہی اردو جس کے اندر وصول کرنے اور جذب کرنے کی بے پناہ صلاحیت ہے ایک نیا لسانی لب و لہجہ اختیار کرتے ہوئے Lingua Franca کا درجہ اختیار کرے گی اور صوبوں میں مزید ہم آہنگی اور برادرانہ جذبات کا باعث بنے گی۔ اہل اختیار و دانش کی موشگافیوں کے باعث بھرا ٹک گئی۔

اس کی ترویج و ترقی کے لیے جو انجمنیں، ادارے، اکادمیاں اور دیگر ثقافت گاہیں بنائی گئی تھیں ان کے ارباب اختیار زیادہ تر وہی لوگ تھے جو زبان کا ایک ترکہ ہندوستان چھوڑ آئے تھے، پیچھے مڑ مڑ کر دیکھنے کی عادت اور ساختہ احساس برتری نے زبان و ادب کے نئے شائقین کو نہ صرف مایوس کیا بلکہ ان میں ایک احساس محرومی بھی پیدا کیا، وہ زبان کے مالکانہ حقوق والوں سے اس لسانی تجربے کا حساب چاہتے تھے جس میں مقامی زمین کا ذائقہ، تاریخ اور کلچر موجود ہو، یہی وہ باب تھا جسے ترک وطن والے لسانی شعور کے زعم میں قلم زد کرنے پر مامور رہے اور پھر وہ وقت بھی آیا کہ ان کی خالص اردو جامعات میں طالب علموں کا صرف انتظار کھینچتی رہی۔

قلم زدگی کے اسی شوق میں دو دو انتہائی قدم اٹھائے گئے، ایک کو ہم اپنی سہولت کے لیے کشافِ اصطلاحاتِ لسانیات کہہ سکتے ہیں، سوئے کوفہ و بغداد و دیکھنے والے زبان کو عرب کے صحرا نشینوں تک لے جانا چاہتے تھے اور ترک غزہ و زن کے شیدائی اسے عجم کے مرغزاروں تک۔ چنانچہ غیر مانوس اصطلاحی تراجم نے اردو روزمرہ کو حکمت کی کتاب بنا کر رکھ دیا اس Cultural and Linguistic Bridge کے تعاقب میں زوال کی ایک اور گھڑی بھی رکھی گئی تھی۔

وہ جو کہتے ہیں "النّاس علٰی دینِ ملُوکِھِم" (بادشاہ کا دین ہی رعایا کا مذہب ہوا کرتا ہے) نئے عہد میں ہماری کرنسی بدل چکی تھی اور ہماری ضروریات بھی، نئی بستیاں آباد کرنے کا شوق اور نئی تجارتی منڈیاں تلاش کرنے کی خواہش، سمندر پار جانا چاہتی تھی۔ اسے جبہ و دستار کی جگہ تھری پیس سوٹ سے دلچسپی تھی، انگریزی انڈرویئر اور جرابیں پہننے والے اور لنڈن کی ہوا کھانے والے مقامی سویوں کا مزہ بھول کر سانتا کلاز کے ہمراہ کرسمس کیک کاٹنے کی رسم ادا کرنا چاہتے تھے، اسی کش مکش نے اردوئے معلّٰی اور اردوئے محلّہ کے مابین ایک اور مقام محمود حاصل کیا جسے عرف عام میں عالمی لسانی تناظر کہا گیا۔

شباب آیا کسی بت پر فدا ہونے کا وقت آیا
مری دنیا میں بندے کے خدا ہونے کا وقت آیا

اب کے یہ ایلس ونڈر لینڈ میں تھی، اسے یہ تو علم نہیں تھا کشش ثقل کے باعث زمین کا کون سا حصہ اسے کھینچ رہا ہے لیکن وہ اپنی طبعی موجودگی کی آرزومند تھی، اسے درکار تھا، اپنے اردگرد پائی جانے والی اشیاء کا یقینی علم، مواد اور ہیئت کے فکری مباحث کے سائنسی تجربہ گاہ، انسانی معراج کی جمالیاتی اور افادی تجسیم و تقویم۔ یہ وہی تحقیق و جستجو اور عقلی استدلال تھا جسے انفرمیشن اینڈ ٹیکنالوجی کا نام دیا گیا تھا۔ اس نئے راستے پر ترسیل و ابلاغ اپنی افادیت کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے، انقلاب و انکشافات کی اس فضا نے عالمگیر سطح پر ایک نئے اندازِ فکر کو جنم دیا۔ ہوسکتا ہے کائنات کے غیر دریافت شدہ تجربوں میں سامراجی ممالک کی ہوس ملک گیری اور اثر و نفوذ ہی کو مدِ نظر رکھا گیا ہو لیکن ان تجربوں کے لیے خیال، ادراک اور زبان ہی کی ضرورت ہوا کرتی ہے جو انسانی زندگی کی تشنگی اور جذباتی شکست و ریخت کو پیرایۂ اظہار دے سکے۔

جدید لغت میں پرانی Progress یعنی ترقی کے لیے Development یعنی تعمیر کی اصطلاح تراشی گئی جس کے تعارف میں سماجی اور معاشی معاملات کی سدھار کا پیغام چھپا تھا، اس نئے پیراڈائم Paradigm کے زیرِ اثر دوسری جنگِ عظیم میں ابھرنے والی سب سے بڑی معاشی طاقت یونائیٹڈ اسٹیٹس آف امریکہ نے پوری دنیا کی معیشت کے بدلاؤ کا وعدہ کیا تھا۔ خاص طور پر وہ دنیا جسے اس نے اپنے کاغذوں میں تیسری دنیا کا نام دیا تھا، خود آگہی اور خود کفالت کے خواب کا نام (Development Support Communication) رکھا گیا، جس کے عقب میں صرف ایک ہی فلسفہ تھا یعنی ابلاغِ عامہ کے ذریعے دنیا کے سب معاشروں کو چھوٹے بڑے مراحل سے گزارتے ہوئے ایک ملے جلے کلچر کی بنیاد رکھی جائے اور ملکی و مقامی صحافت کے وہ فیوض و برکات جو صرف حکومت اور بااثر افراد کے لیے بنائے گئے ہیں لامکانی کی حدود طے کرتے ہوئے مخصوص بڑی طاقت تک پہنچ جائیں۔

ادھر ایشیا کے (House of dead) میں رہنے والے سازشی نظام کے لوگوں کو الہام و القا کی استبدادی کرشمہ سازیوں کا بھی تجربہ تھا، یہ وہی عوام الناس تھے جنہیں حادثاتی طور پر سنسکرت کے مقدس اشلوک سننے کی پاداش میں اپنے گوشۂ سماعت کو پگھلتے ہوئے سیسے کی نذر کرنا پڑا تھا۔ یہ وہی اچھوت تھے جو آتش پرست ایرانیوں اور خدا پرست عربوں پر ایمان لائے تھے، یہ وہی مظلوم تھے جو پہلوی اور دری کی سنانوں سے داغے گئے تھے، یہ وہی چماروں کا کنبہ تھا جو عہدِ انگلیشیہ میں ہندوستانی سماج کے سینے کا بوجھ تھا، ان کی قسمت میں ہزیمت اور مہاجرت لکھی گئی تھی، کبھی ذات پات کے نام پر، کبھی مذہب کے نام پر، کبھی روایت کے نام پر، کبھی ہدایت کے نام پر، ان کے حکمرانوں اور خداؤں کی زبان مخلوق کی زبان سے مختلف تھی اور شاید ان کے حیاتیاتی نظام میں وہ لمحہ موجود نہیں تھا جب وہ اپنے خالق سے براہِ راست مخاطب ہونے کی مسرت سے ہمکنار ہو سکیں اور اب قیس و کولکن کی آزمائش کے لیے انگریزی ایک نئی صراط بنی جا رہی تھی۔

حرف پڑھنا پڑا ہے ٹائپ کا
پانی پینا پڑا ہے پائپ کا
پیٹ دکھتا ہے آنکھ آئی ہے
شاہ ایڈورڈ تری دہائی ہے

۱۵۵۰ء میں پرتگالیوں اور ۱۷۷۴ء میں انگریزوں کے مطبع خانوں سے انیسویں صدی کے ٹیکنالوجیکل انقلاب تک کئی مقامات آہ و فغاں ہیں۔ ۱۸۰۲ء کا کلکتہ ہندوستانی پریس، مقامی منشی، باغ و بہار، داستان امیر حمزہ اور اسی قبیل کی دوسری شہرہ آفاق

داستانیں بادشاہی نظام کے خلاف گلکرائسٹ کی میڈیا پالیسی کا منہ بولتا ثبوت ہیں، چہار درویشوں کے زیر اثر پنپنے والے ایک Passive معاشرے میں خواجہ سگ پرست کی انسان دشمنی اس (Cultivated Theory) کا ایک حصہ ہے جس نے آگے چل کر بہادر شاہ ظفر کو رنگون پہنچایا۔ ۱۸۳۷ء کا سید الاخبار اور خیر خواہ ہند انگریزی کلچر کے اثبات کی دلیل ہیں۔ سرسید اور ان کے رفقائے کار، تعلیمی نظام میں ان رفقا کی مستقل موجودگی، پنجاب بک ڈپو کے عنوان بند مشاعرے، مقامی ادیبوں کی کتب پر ملنے والے انعامات۔ یہ ہے وہ ٹیکنیکل حکمت عملی جس نے ایک ہزار سال حکمرانی کرنے والے مسلمانوں کو ایک مہاجر قبیلے میں بدل کر رکھ دیا۔ زبان و بیان کی فصاحت و بلاغت شکست و ریخت کے ہاتھوں کب ریختہ میں تبدیل ہوئی اور سپہ سالار کب لشکر کے مؤدب سپاہیوں میں بدلے اس شعبدہ بازی کا سہرا اخبر و نظر کے سائنسی نظام کو جاتا ہے، یقیناً با اختیار لوگ ہجوم کی نفسیات پر نظر رکھتے ہیں اور اپنی طاقت کی بحالی کے لیے ابلاغ کے ذرائع کو اپنا Change Agent سمجھتے ہیں آج کی Intensive Technology کا دارومدار بھی ملٹی نیشنل کمپنیوں اور بین الاقوامی اداروں کے قرضہ جات کا مرہون منت ہے جن کا کہنا ہے تعمیر کے عمل کو Per Capita Income کے آئینے میں دیکھیے جس کے ثمرات کبھی نہ کبھی غریب آدمی تک بھی پہنچیں گے۔ اگر چہ سماجی اور تہذیبی بدلاؤ کے اس منظر نامے پر ماحولیاتی آلودگی، تیل کا بحران، جمہوریت، تیسری دنیا کے مسائل، دہشت گردی، انسانی حقوق، حقوق نسواں، چائلڈ لیبر، جینڈر ریلیشنز، ایجوکیشن، ہائر ایجوکیشن، غربت کا خاتمہ، صحت، فیملی پلاننگ اور ایسے ہی کئی آفاقی مسائل کے لیے (Free Flow of Information) کا بھی انتظام کیا گیا ہے لیکن Development Communication Support کے اس عہد میں بھی ہماری اردو صحافت انگریزی ایسوسی ایٹڈ پریس کی مرہونِ منت ہے، ہماری نیوز ایجنسیاں قبولیت کی سند کے لیے سی این این اور بی بی سی کی محتاج ہیں۔ بین الاقوامی ابلاغیاتی چینلز اور ان کے فیڈ بیک Feed back پسماندہ ممالک کی خدمت سے قاصر ہیں۔

یورپ اور اس کے اتحادیوں نے پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے دوران اس بات کا اندازہ کیا تھا کہ جنگ ہمیشہ انفرادی طاقت اور لڑائی مارکٹائی سے نہیں جیتی جا سکتی اور یہ بھی کہ فاتح اقوام بہت دیر تک مفتوحہ علاقوں کے ثمرات سے بلا شرکت غیرے فائدہ نہیں اٹھا سکتیں، ان کا کالونیلزم کا تجربہ بھی آخر کار شکست سے دوچار ہوا تھا، چنانچہ بیسویں صدی میں ہوس ملک گیری نے ہوس زر کی خواہش کے نام پر کھڑے اور کبھی کی باضابطہ نفسیات کو سماجی نفسیات کا نام دیتے ہوئے ایک اور محفوظ راستہ اختیار کیا۔

اب کے فاتحِ زمانہ کا پہلا ٹارگٹ (State of Mind) ہے اس نے اصنام خیالی سے ہرچاہنے والے کو کافر بنا دیا ہے اور پرستاری وہم کے لیے حسن اظہار، فنِ اظہار، حقِ اظہار اور قانونِ اظہار کے اسمائے مقدس لایا ہے۔ عالمی کلچر کی تخلیق اور انسانی عالمی تہذیب کے لیے اسے ہمیشہ سے فری مارکیٹ کی تلاش رہی ہے جہاں وہ اپنی اکانومی کا خالص نظام رائج کر سکے، ابلاغیات کے ماہرین جانتے ہیں کہ نیا حکومتی ڈھانچہ تشکیل دینے، لیڈر شپ بدلنے اور کسی بھی مقامی زبان کی تبدیلی کے لیے کن پیرامیٹرز کی ضرورت ہوا کرتی ہے، اردو کے لباس میں بڑے سلیقے سے انگریزی نگینے ٹانکے جا رہے ہیں۔ مقامی انا پرست تجارت پیشہ بااثر طبقہ اور مقامی مفلوک الحال دن میں خواب دیکھنے والے سب اس تبدیلی پر نازاں و فرحاں ہیں۔ یوں سمجھیے ایک White elephant ایک Ivory Tower میں گھس آیا ہے اور Big Bang منادی کر رہا ہے ایک اور تہذیب، ایک اور تاریخ، ایک اور زبان مختلف سمتوں سے بہتی ہوئی ہمارے گھروں کے کونوں کھدروں تک آ پہنچی ہے۔ پرنٹ میڈیا کے نام پر اخبارات و رسائل، میگزین،

فیشن میگزین، کتابیں، عدالتی کارروائیاں ہماری منتظر ہیں اور جامد Static Media خاندانی منصوبہ بندی کے دیواری اشتہارات سمیت مختلف سماجی مہموں کو آگے بڑھاتا ہوا پوسٹر اور ڈس پلے کی شکل میں سڑکوں پر چہرہ نمائی کر رہا ہے لیکن انگریزی سے فیض یاب اردو کا اصل میدان الیکٹرانک میڈیا ہے۔ ریڈیو ہمارے کھیتوں کھلیانوں کا رفیق ہے جو کسی اشتہاری کیڑے مار دوائی کے نام کا اعلان کر رہا ہے۔ وڈیو کیسٹ ہماری شریک سفر ہے اور کسی نئے گیت کی دھن بجا رہی ہے، وی سی آر ہماری تعلیمی، گھریلو، مجلسی، رسوماتی زندگی کا ریکارڈ کیپر بنا بیٹھا ہے۔ پراجیکٹر تعلیمی نظام اور معلوماتی پروگرام پیش کر رہے ہیں۔ فلم اپنے خاص پیغام کے ساتھ خاص ناظرین کو خاص ماحول میں متاثر کرنے میں مصروف ہے۔ سلائیڈ ز اور اوور ہیڈ ٹرانسپرنسیز تکنیکی مواد کو تحقیق کے لیے محفوظ کیے ہوئے ہیں اور سب سے بڑھ کر ٹیلی ویژن، کیبل، ڈش انٹینا ہماری مجلسی زندگی کا خاص مہمان ہے۔ تفریح و تسکین، اوہام و یقین، جنس و جرائم، تشدد و محبت، معیشت و مذہب، کھانا پکانے کی ترکیبیں، بیماریوں کا علاج، موسم کا حال، دنیا جہان کی خبریں، جنگلی جانور، ہنگامی حالات، آسمانی آفات، ایک چھوٹا سا ڈبہ پنڈورا بکس بن کر رہ گیا ہے۔

خبروں کی اس خرید و فروخت میں میڈیا کہیں Watch dog ہے کہیں سماجی کارکن، کہیں گلیوں بازاروں میں دہشت گردی کا نمائندہ کہیں ویلنٹائن ڈے کا پرامن پادری، کہیں بروکر، کہیں ہمدم و ہم نوا، کہیں "پر سوائیشن"، کہیں پراپیگنڈا۔

جی ٹھٹک نہ جائے گرمی بازار دیکھ کر

سینکڑوں چینل، درجنوں زبانیں، بیسیوں لب و لہجے سماعت و بصارت پر حملہ آور ہیں۔

Information, Education, Entertainment ایک اور مثلث میں ڈھلتی ہے۔ Media, Audience, Society اور پھر نتیجہ مرتب ہوتا ہے۔ Disorder, Conflict, Change سماجی تغیرات کے شماریاتی تجزیے اور خاص پیغامات کی نفوذپذیری طبقاتی سطح پر ایک فرضی Knowledge gap کا باعث ہے۔ اسی شخصی انہدام کے معاشرے میں جہاں دنیا کے بارے میں ہماری ذہنی تصویر بدل رہی ہے الجزیرہ کے معمولی سے چینل سے ایک گم شدہ آدمی کی آواز ایک اور طرح کی موجودیت کی علامت بنتی ہے ہو سکتا ہے یہ یورپی تسلط کا کوئی مصنوعی ہیولیٰ ہو جو خوف و ہراس پھیلا کر مطلوبہ نتائج تک پہنچنا چاہتا ہے لیکن اسی دہشت میں ایک مثبت پہلو بھی ہے کہ اگر آپ واقعتاً کوئی پیغام رکھتے ہیں، آپ کا کوئی نظریہ ہے کوئی زبان ہے تو ان ہتھیاروں کی موجودگی میں آپ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

کسی بھی شعوری نظام کے لیے اطلاعات کا آتش فشاں موجود ہی ہوتا ہے، کوئی بھی ذہنی اور اختیاری فیصلہ اپنے خیالات بھی رکھتا ہے اپنی زبان بھی اور ایقان بھی، اسے معانی کی تلاش کی ضرورت نہیں وہ اپنے ارادے سے زبان کو ایک منطق میں تبدیل کر سکتا ہے، ابلاغ عامہ کے Change Agent اچھی طرح جانتے ہیں کہ عوام کو بات صرف انہی کی زبان میں سمجھائی جا سکتی ہے۔

ہمارے اردو ذرائع ابلاغ جو تعمیر اور مددگاری کے شدید بہاؤ پر ہیں کئی طرح کے پیغامات کے عکاس بنے بیٹھے ہیں۔ مقامی اخبارات اور مقامی ریڈیو چینل نے تجارت اور سیاست دونوں کے لیے زمین ہموار کی ہے، عمومی ضروریات سے متعلق اعلانات بھی فائدہ مند ثابت ہوئے ہیں، لیکن ان ذرائع ابلاغ کی بڑی بیانیت ان کی بلیک میلنگ ہے۔

الیکٹرانک میڈیا میں ہوم ٹیلی ویژن جسے کیبل کی رفاقت حاصل ہے، ہمسایہ ملک میں بولی جانے والی اسی زبان کا بہت مددگار ثابت ہوا ہے جسے ہندی اردو کے تنازعے میں علیحدہ ہونا پڑا تھا۔ اردو کے اس سمعی تال میل سے عام ناظر کے ہاں ہندوستان

دشمنی کے جذبات میں کمی آئی ہے۔

اردو کے وہ چینلز جو دبئی یا عرب امارات سے شروع کیے گئے ہیں اپنے مخصوص عزائم رکھتے ہیں۔ سنسنی خیزی، افواہ سازی، تشویش، مبالغہ آرائی، شخصی تحقیر، بلاجواز مباحث، انحراف توجہ اور معمولی باتوں کو اہم واقعات بنا کر پیش کرنا ان کے پروگرام کا حصہ ہے۔ خاص دنوں میں ان کی نشریات اردو زبان کی ترقی کا بڑا ذریعہ ہیں۔

ادھر سرکاری ریڈیو اور سرکاری چینل ہمہ وقت حکومتی پراپیگنڈے، بین الاقوامی مہمات کے زیر اثر پیش کردہ ڈراموں، بے مقصد مباحث، سیاسی بیان بازی اور مخصوص چہروں کی موجودگی سے ایک قدیم تہذیب کا منظر نامہ پیش کرتے ہیں تاہم اردو زبان کے توسط سے ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ ہمارا اردو میڈیا آزاد میڈیا کی سرحد سے بہت دور ہے۔ کچھ عرصے سے الیکٹرانک میڈیا کی ملٹی میڈیا زبان خالص اردو پر اپنے اثرات چھوڑ رہی ہے، کمپیوٹر اور موبائل کے قدیم ٹائپ رائٹر نے گلکرائسٹ کی طرح ایک بار پھر زبان پر ہی حملہ کیا ہے، جدید آلات (Modern Devices) کے ذریعے Grass roots تک تبدیلی لانے والے اداروں کی سطح پر ہماری عادات اور ہمارے عقائد پر پوری قوت سے اثر انداز ہوئے ہیں۔ "سنڈے برنچ" کھاتے ہوئے، "سوفٹ ڈرنکس" پیتے ہوئے "ٹشو پیپرز" سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے اس "گلوبل ویلج" کی لامکانی میں اردو کو شاید انگریزی رسم الخط کی رفاقت میں تیسری لکھاوٹ میں تبدیل ہونا پڑے لیکن اس تیسری ہجرت میں ہم غریب الدیار، اطاعت گزار لوگوں کا اگلا پڑاؤ کہاں ہوگا یہ معاملہ ابھی صیغۂ راز میں ہے۔

منزل ہے کہاں تیری اے لالۂ صحرائی

E:\makhzan\New Folder\8.jpg not found.

ڈاکٹر عطش درانی

اُردو میں ابلاغ اور جدید اطلاعیات

ہم اپنی بات کا آغاز اس خوشخبری سے کرتے ہیں کہ ہم نے کمپیوٹر سکرین کو اردو میں بدل دیا ہے۔ مائیکروسافٹ ونڈوز ایکس پی اور آفس ۲۰۰۳ اب اردو میں ہیں اور کمپیوٹر سیکھنے کے لیے انگریزی جاننا، ای میل یا ویب سائٹ قائم کرنے کے لیے حتیٰ کہ ویب سائٹ کا پتا (www) لکھنے کے لیے بھی اب رومن حروف درکار نہیں۔ اسی طرح موبائل فون نوکیا، موٹورولا بھی اب اردو میں دستیاب ہیں۔ جدید اطلاعیات (Informatics) کے حوالے سے ابلاغیات میں یہ بہت بڑا انقلاب ہے اور ہم یہ انقلاب لا چکے ہیں۔

دنیا کی چار ہزار زبانوں میں سے صرف ۴۱ زبانیں ابھی تک کمپیوٹر کے ذریعے انٹرنیٹ پر آ سکی ہیں اور صرف ۲۳ زبانوں کے مشینی ترجمہ کے سافٹ ویئر بن سکے ہیں۔ جبکہ دنیا میں ۲۶ زبانیں دفتری اور تعلیمی ضروریات پوری کر رہی ہیں۔ رسم خط کے لحاظ سے ابھی تک ساٹھ رسومِ خط تسلیم ہو سکے ہیں۔ دنیا کی زبانوں کو جدید ٹیکنالوجی کا دیو ہڑپ کیے جا رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اب صرف وہ زبان باقی بچے گی جو جدید اطلاعیات کی ٹیکنالوجی میں استعمال ہوگی۔ باقی زبانیں علمی دنیا سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جائیں گی۔ یہ بات نوشتۂ دیوار کی طرح اٹل ہے۔ اردو کے حوالے سے تو اب یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ اردو اطلاعیات ہی اردو کا مستقبل ہے۔

دنیا بھر میں اس شاہراہِ اطلاعیات نے دانش، تفکر، علم اور ابلاغ کے راستے ہی بدل ڈالے ہیں۔ کمپیوٹر اب تدریس کا بھی اور تحریر و صوت کا بھی سب سے بڑا واسطہ (Medium) بن چکا ہے اور بہت جلد شاعر اور نثر نگار کی جگہ بھی لینے والا ہے۔ کبوتر کی طرح محض آنکھیں بند کر لینے سے اس کا جادو سر چڑھ کر بولنے سے نہیں رہ سکتا۔ یہ باتیں ایک ان دیکھی طلسماتی دنیا کی لگتی ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ ہزار سال پہلے کی ہزار داستان کا الف لیلوی ماحول اپنا حقیقی آغاز کر چکا ہے۔

اس بحث سے قطع نظر کہ ہماری زبان، ادب اور ثقافت کو اپنے ابلاغ کے لیے اردو کے اس نئے واسطے کی ضرورت ہے یا نہیں اور آیا یہ آزاد فضا میں غیر ترقیاتی انداز میں زندہ رہ سکتی ہے یا نہیں، ہمیں اردو کو اس جدید ٹیکنالوجی کے حوالے سے دیکھنے کی کوشش کرنا ہوگی۔

اردو اطلاعیات کا شعبہ ۱۹۹۸ء سے کام کر رہا ہے اور اس میں کام کرتے ہوئے میں اگلے پچاس برس بعد کی اردو کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا، کانوں سے سن رہا اور اگر کہیں تو زبان سے بول رہا ہوں۔ "پاکستانی اردو کے خدوخال" میں جس "اردش" قسم کی زبان کی پیش گوئی کی تھی، وہ اکیسویں صدی کے آغاز ہی میں اک کڑی دھوپ بن کر ہمارے سروں پر آ گئی ہے۔ جس ادبی مخز

(Literary Discourse) میں ہم نے تربیت مطالعہ و تحریر پائی تھی، نئی نسلوں میں اس کا قاری عنقا ہو گیا ہے اور اب وہ نیا قاری جس زبان کا عادی ہو چکا ہے، ہمارا شاعر اور ادیب اس میں اظہار کی راہ نہیں پا رہا۔ قلم سے کاغذ پر لکھنے والے کلیدی تختے، برقیاتی گتے اور صوت نگاری کی سان پر نہیں چڑھ رہے۔ ہم جس ادبی مختصر اور علمی کینڈے (Academic Genre) کی بات بیسویں صدی میں کرتے تھے، وہ اک قصہ پارینہ بن چکا ہے۔ حرف اور عبارت کا جو واسطہ ہمارے زیر استعمال رہا ہے، اگلی نصف صدی میں شاید اس کی ضرورت ہی ختم ہو جائے۔ متن تا صوت اور صوت تا متن کی تمام ترمنتقلی کا کام کمپیوٹر سنبھال لے گا۔ ایک اندازے کے مطابق ہر ڈیڑھ سال بعد کمپیوٹر کا سائز دوگنا چھوٹا اور قوت دوگنا زیادہ ہو جاتی ہے۔ ایک چوتھائی صدی پہلے کے بڑے بڑے الماری نما کمپیوٹر بیسویں صدی کے آخر میں صرف میز پر اور اکیسویں صدی کے آغاز پر ہتھیلی میں آ چکے ہیں۔ اب اگلے عشرے تک یہ کان اور آنکھ پر اور اس کے بعد کے دو عشروں بعد صرف دماغ کے اندر نصب ہو جائیں گے۔ تب شاید انتقال و ابلاغ کے لیے بول چال کی ضرورت بھی باقی نہیں رہے گی۔

ایسے میں اردو کی صورت کیا ہو، اس کے ادبی و علمی پہلوؤں کی تدریس کا اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا؟ اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

جدید اطلاعیات کا یہ الف لیلوی جن بوتل سے باہر آ چکا ہے مگر اس سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کوئی الہ دین ضرور ہوگا جو اس جن کو غلامی پر مجبور کر دے گا۔ یہ کام تو ہم سب کے کرنے کا ہے لیکن اگر سب ایسا نہیں کر سکتے تو کم از کم اخلاقی سطح پر اس الہ دین کو تقویت ہی بہم پہنچاتے رہیں۔ یہی اردو کے حق میں بہتر ہے۔ ورنہ اردو کی داستاں تک بھی ------

جدید ٹیکنالوجی کا یہ پہلو اردو دوستوں سے دردمندی سے غور و فکر کا متقاضی ہے۔ اب تک ہم نے جن امور کو سطحی اور نچلے درجے کا سمجھا تھا اور آزاد فنون کی جن سطحوں کو بورژوائی مقام دے رکھا تھا: انھیں اتھل پتھل کرنے کی ضرورت ہے۔ سندھی لینگویج اتھارٹی اور پشتو اکیڈمی کو بھی میرا یہ مشورہ پہنچا تھا مگر ادبی نقارخانے اس نحیف طوطی کی آواز شاید سن نہیں پا رہے۔

اردو پر نوری نستعلیق کے حوالے سے ۱۹۸۰ء میں احمد مرزا جمیل کا ایک احسان ہوا۔ پھر بھارت میں "اِن پیج" کے لفظ کار سافٹ ویئر سے ہماری بہت سی کتابت کی ضرورتیں پوری ہونے لگیں تو ہماری اکثریت مطمئن اور خوش ہو کر بیٹھ گئی کہ اردو کمپیوٹر پر آ گئی ہے جبکہ وہ محض سکرین پر نظر آ رہی تھی۔ ہماری کتابیں اور اخبارات اس پر دھڑا دھڑ چھپنے لگے۔ یہ حقیقت بہت کم لوگوں کو معلوم تھی کہ یہ سافٹ ویئر صرف لفظ کار ہیں، کمپیوٹر کار نہیں اور یہ صرف تصویری اساس پر عمل کرتے ہیں۔ یہ کمپیوٹر پر جگہ یا میموری ہزار گنا زیادہ گھیرتے ہیں۔ ان کی رفتار انگریزی کے سافٹ ویئروں سے سو گنا کم ہے اور انٹرنیٹ/ ویب سائٹ/ ای میل وغیرہ کی دیگر ضرورتیں پوری نہیں کر پاتے۔ چنانچہ جب ہم نے کمپیوٹر سکرین پر اردو کی جلد چڑھا دی تو مائیکروسافٹ نے اسے پیش کرنے کے لیے نسخ (تہامہ) فانٹ کا سہارا یہ کہہ کر لیا کہ ابھی نستعلیق کا کوئی کمپیوٹری موزوں فانٹ موجود نہیں۔ چنانچہ اک دوڑ لگ گئی۔ اس سے پہلے نادرا کو شناختی کارڈ بنانے کے لیے اردو کوائف کی تلاش کے لیے اردو کے فانٹ کی ضرورت تھی۔ ترتیب، تدوین اور پیش کش کے کئی مسائل درپیش تھے۔ کچھ طالع آزما کمپیوٹر سائنس کی دنیا سے اٹھے اور اردو اطلاعیات کی اس لیڈر شپ پر قبضہ کر لیا۔ معاملات پھر بھی جوں کے توں

رہے۔ضرورت اردو کے ایسے ماہرلسانیات کی تھی جو ٹیکنالوجی کے ادق مسائل سے بھی واقف ہو اور نچلی سطح کے ان امور پر اعلیٰ تفکر و تدبر بھی کر سکے۔اردو کے ادیبوں اور پروفیسروں سے رجوع کیا گیا مگر وہاں تو انتقادی سطور پیش پیش تھیں اور صرف تفہیم و تشریح کی بات تھی۔تجزیے،تقابل اور ڈیزائن تو کوسوں دور تھے۔ایسا کام تو مستریوں اور کمپوڈروں کے کرنے کا تھا۔

مقتدرہ قومی زبان کا مرکز فضیلت برائے اردو اطلاعیات اس میدان میں آگے بڑھا۔اس کے عزائم تو بہت بلند تھے۔فی الوقت اس کی کارکردگی یہ ہے کہ اس نے مائیکروسافٹ جیسے اداروں کے ساتھ مل کر بہت سے معیاری اوزار وضع کیے ہیں، جن سے کمپیوٹر سکرین اردو میں بدلی ہے۔اردو میں ای میل ممکن ہوئی ہے۔اردو ویب سائٹ، برقیاتی کتاب، برقیاتی اشاعت اور برقیاتی رابطوں کی صورتیں سامنے آئی ہیں۔ایک بنیادی اردو فانٹ "پاک نستعلیق" کے نام سے ایجاد کیا گیا ہے، جو خالی حروف کی بنیاد پر تمام پاکستانی زبانوں کو ایک ہی وقت میں پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔یہ ان پیج سے نوے گنا تیز رفتار ہے اور ہزار گنا کم جگہ گھیرتا ہے۔اس میں خالی جگہ حروف + نقاط اور شوشے استعمال کیے گئے ہیں۔اب کوئی پاکستانی یا عربی حروف میں لکھی جانے والی زبان اس کی دسترس سے باہر نہیں۔ اس مرکز کی طرف سے اب مشینی ترجمہ کا سافٹ ویئر پیش کیا جانے والا ہے۔پہلا مرحلہ دفتری انگریزی اردو کا ہے۔اگلا مرحلہ سائنسی و تکنیکی، پھر صحافتی اور شاید آخری مرحلہ ادبی ترجمے کا ہوگا۔لطف کی بات یہ ہے کہ تکنیکی ترجمے کا سافٹ ویئر بنانا آسان ہے اور ادبی ترجمہ سب سے مشکل کام ہے۔

ادیبوں کے لیے کمپیوٹر پر کام کرنے میں حائل کلیدی تختہ کو بہت جلد ختم کر کے "تحریری گتہ " بنا کر دیا جا رہا ہے، جو قلم کاری کو کمپیوٹر کی لفظ کاری میں بدل دے گا اور یوں ادیب کاغذ کی بجائے براہ راست بلا کسی کلیدی تختے کے نوری قلم کے ذریعے سکرین پر لکھ سکیں گے اور اسے کسی بھی فانٹ میں تبدیل کر سکیں گے۔تحریری دستاویزات عکسی (Scan) ہو کر لفظ کاری میں بدل سکیں گی۔ قدیم دستاویزات اور کتابیں آسانی سے کمپیوٹر سے عمل کار ہو سکیں گی۔اگلے مرحلوں میں ہاتھ کی بجائے آواز کے ذریعے تحریر اور تحریر سے بات چیت کا عمل بھی انجام دے لیا جائے گا۔

مرکز کا یہ پراجیکٹ بہت جلد انسٹی ٹیوٹ کا درجہ پانے والا ہے۔جو اردو اطلاعیات میں ماہرین تیار کرنے کے لیے مابعد ڈاکٹریٹ تک کی تدریس و تحقیق بھی انجام دے گا۔

اردو کا ایک بہت بڑا ذخیرہ (Bank) وضع کیا جا رہا ہے جو ایک کوائفیہ (Database) کی صورت میں اردو کے کسی لفظ، ترکیب، محاورے، جملے، مصرعے، شعر کو اس کے معنی، مفہوم، ربط، تعلق، تعدد، حوالے کے ساتھ مابعد لغات امور کے طور پر پیش کر سکے گا۔یہ عمل برعکس بھی ہوگا۔یعنی خیال سے معنی کا سفر بھی۔ایک اندازے کے مطابق اس میں ساڑھے تین لاکھ الفاظ و اصطلاحات، چھ کروڑ اشعار اور دو کروڑ سے زائد جملے اور فقرے ہوں گے۔اردو کا یہ کوائفیہ وضع کر لیا گیا ہے۔اب صرف مطلوبہ معلومات/کوائف کا اندراج باقی ہے اور یہ سب کچھ مفت میسر ہے اور ہوگا۔

اردو کے لیے جدید ٹیکنالوجی کے تحقیقی و تدریسی امور کا احاطہ مندرجہ ذیل پہلوؤں سے کیا جانا چاہیئے:۔

۱۔رسم الخط	۲۔متن	۳۔ترجمہ	۴۔صوتی رابطے

۵۔ذخائر	۶۔اشاعت	۷۔تدریس	۸۔تحقیق

رسم خط: رسم خط میں بہت سے امور شامل ہیں۔جن کی تعریف،تصریح اور تحقیق درکار ہے۔مرکز فضیلت اردو کے حوالے سے نستعلیق رسم خط پرکام کررہا ہے۔اس کے دائرۂ کار میں حروف تہجی (صرف مصمتوں کی اکائیاں)،ابجد (مصمتوں اورمصوتوں کی بنیادی اکائیاں)، ہجا(ایک یا زائد مصمت اورایک مصوتے کا جوڑ)،ابوجدا(حروف وہجا کا ملاجلا سینٹ)،ترسیمہ(مل کر لکھے گئے حروف جو ا،ر،د،و، پر ختم ہوں)،ترقیمہ(نشانات)،علامتیات، رموزاوقاف،ترتیب حروف، جوڑکا (Joinder)،سمتِ تحریر،معنویاتِ حروف،اندازِ عبارت، فاصلِ تحریر، دندانے،شوشے، حرکات،صوتیاتی الفبائی حروف، ہندسے، فاصلِ تاریخ، کرنسی علامات، اضافی علامات، آرائش، فاصلہ جات، رجوعی نقلِ حرفی اور دیگر کئی متفرق امور شامل ہیں۔جنھیں موضوعی کی بجائے معروضی اور رجوعی انداز میں معیار بند کرنا ضروری ہے۔اس مقصد کے لیے عالمی معیارات وضع کیے جارہے ہیں۔ حروفِ ابجد کی معیار بندی کی گئی ہے۔کئی "رہنمائے وضع "بنائی گئی ہیں۔عالمی ضابطوں کے لیے یونی کوڈنگ کی رکنیت حاصل کی گئی اوراس میں اردو کے لیے تبدیلی کی کوششیں کی گئی ہیں۔

دوسرا مرحلہ ادخالِ متن کا ہے،جس سے الفاظ اوران کی حد،بنیادی ذخیرہ ءالفاظ،مجازی ذخیرہ ء الفاظ،معجمی (تھیسارس کا ذخیرہ ءالفاظ،معنویاتی روابط،معیاری املا،معیاری ہجے،صوتیے،مصوتے،مصمت،سادہ جملے کی حدود،افعال اورزمانے اوران میں استثنا،مرکب جملے کی جدولیں،حدودِ جملہ وحدودِ فقرہ،نحو، طےشدہ (default) نحو،استثنا،متبادل نحو،کمپیوٹری لسانیات،کمپیوٹری ترتیبات، طرزیات (Syslistics)، تدوینِ متن، قواعد کی جنس، تعداد، املا کے لحاظ سے لفظ کی صورتیں، تصوریات (Conceptology)،معجمی یا تھیسارس کے حوالے سے معنوی تعلق،تلازماتِ لفظی(Word Associations)،معنویات کی سطحیں، بول چال کے سانچے(Registers)، کینڈے(Genres)، متنیت(Textuality)، توسل(Mediation)،زبانی وتحریری مخرج اورثقافتی انداز اورتجزیے،وضعی،لغوی اور مستعمل صورتیں،کمپیونظم کے سانچے(صدر، ضرب، ردیف،وزن،بحور)،کمپیوانشا(۲تا۵ پیرا)،حدودِتحریر وغیرہ کئی پہلو شامل ہیں۔ان کے لیے متعدد فہرستیں اپنی خصوصیات کے ساتھ مرتب ہونی چاہئیں۔

تیسرا مرحلہ ترجمہ کی ایسی مشین بنانے کا ہے جو خودکار ترجمے اورترجمانی کے کام آسکے۔اس میں نقل یا ترسیم حرفی (Translitrational Graphics)سے لے کرلفظ کی خاصیت،علمِ ترجمہ،سادہ جملوں کا تقابلی مقام،مرکب جملوں کی تقسیم اورانگریزی سے تقابل اورمنتقلی کے فارمولے،استثنا،ترتیبِ نو اوراس کے اضافی امور،مثال اساس (Example Based) ترجمے اورعلم اساس(Knowledge Based) ترجمے کے تقاضے،مخری مشینی ترجمہ،کمپیوٹرامدادی ترجمہ (CAT)،خودکار ترجمہ مشین(MT)اوران کے لیے درکارکمپیوٹرا ساس لغات اور فرہنگیں بنانا مقصود ہیں۔اگرچہ کئی معیاری فرہنگیں اور جدید جدولیں تیارکی گئی ہیں۔دنیا میں ترجمے کے کئی سافٹ ویئر(TRADOSوغیرہ)موجود ہیں مگرابھی ایک ہفت خواں طے کرنا باقی ہے۔

۴۔صوتی رابطے: آواز سے حروف اور حروف والفاظ سے آواز تک تبدیلی کے لیے تعبیر و خاصیت کے حوالے سے معیاری فرہنگوں، صوتی تجزیوں، صوتی ابجدوں، لہجوں اور شدتوں کی پیائش کی ضرورت ہے۔اس سے صوت نگار (Phonogram) وجود میں آئیں گے۔فاسٹ یونیورسٹی لاہور کے طلبہ نے ایسے کئی منصوبے انجام دیے ہیں۔"اخبارِ اردو" میں ان کی اشاعت ہوتی رہی ہے۔

۵۔ذخائر: اردو کوانفیہ ذخائر کے حوالے سے بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔اردو کے کوانفیہ کو آگے چل کے کثیر لسانی کوانفیوں میں بدلنا، پانچ لاکھ پچھتر ہزار اصطلاحات اور ایک کروڑ ستر لاکھ تصورات کی اردو میں منتقلی اور باہمی ربط کے ساتھ ذخیرہ کاری ایک بہت بڑا چیلنج ہے۔یوروپی کمیشن کا ایک ایسا مرکز نو زبانوں کے لیے لکسمبرگ میں کام کر رہا ہے اس کے تعاون سے اردو کوانفیہ بھی یہ تمام تصورات پیش کر سکے گا۔

۶۔اشاعت: کمپیوٹر کے ذریعے اشاعتی امور اتنے سادہ نہیں جتنے اردو دنیا کو نظر آتے رہے ہیں۔اشاعت کی (DTP) ضروریات ان پیج وغیرہ جیسے سافٹ ویئر سے پوری نہیں ہو پاتیں۔اس پہلو پر اڈوب (Adobe) کی مدایات (Acrobatics) کی ضرورت ہے۔جو پی ڈی ایف (PDF) اور دیگر لفظ کاری مسلیں اور پوشے (Word Processing Files and Folders) حسبِ ضرورت وضع کر سکے۔مرکز فضیلت بہت جلد اس میں بھی پیش رفت حاصل کر لے گا۔

۷۔تدریس: اردو میں اعلیٰ سطح پر تدریس کے حوالے سے کئی طرح کے سافٹ ویئر وجود میں لانے کے لیے اردو کی بنیادی تحقیق درکار ہے جس میں معیاری متن کی تشکیل، تدریسی اسباق، متعامل (Interactive) اسباق، مشقی کہانی، لفظی بنت کار (Weaver)، کمپونظم، کمپوانشا، کمپومکالمہ، تدریسِ خواندگی، اختلافِ اشتقاق و امکانات، تدریس، تدریسی کیٹڈے وغیرہ کے متعدد تشریحی پہلو شامل ہیں۔یہ کام اردو دانوں، اردو کے شعبوں اور اکادمیوں کے کرنے کا ہے۔اس سے ابلاغیات، ادبیات اور تعلیم کی تکنیکی پہلوؤں سے ترقی اور مہارت کے کئی گوشے وا ہوں گے۔

۸۔تحقیق: اردو کے دوستوں نے تو ابھی تحقیق کی وادی میں قدم نہیں رکھا تھا اور اب ہائر ایجوکیشن کمیشن کے ہاتھوں پریشان ہو رہے ہیں۔تحقیق ایک طریقِ کار ہے اور محض اسی طریقِ کار پر عمل پیرا ہو کر ہی تحقیق انجام دی جا سکتی ہے۔اردو کے ساتھ ساتھ اردو اطلاعیات کے مندرجہ بالا سمیت بہت سے امور میں تحقیق درکار ہے۔اصولِ تحقیق کے کئی انگریزی سافٹ ویئر (SPSS وغیرہ) موجود ہیں جو کوائف کے باہمی تعلق کی جدولیں وضع کرتے ہیں، انھیں اردو میں ڈھالا جانا مقصود ہے۔کمپیوٹری لسانیات پر جو تھوڑا بہت کام دیگر اداروں میں ہو رہا ہے، اس میں پشاور یونیورسٹی، فاسٹ لاہور اور اسلامیہ یونیورسٹی اسلام آباد کے کمپیوٹر سائنس کے شعبوں میں قدرے تحقیق انجام پا رہی ہے۔

اب اگر ایک نظر ان ضمیموں پر ڈالی جائے جو اس مقالے کے ساتھ منسلک ہیں تو ذرا زیادہ وضاحت ہو سکے گی۔پہلے ضمیمے میں اردو کے معیاری حروفِ تہجی اور اس کی ترتیب علت دی گئی ہے، جو مقتدرہ قومی زبان کے ویب سائٹ www.nla.gov.pk پر بھی موجود ہے۔اس کی معیار بندی پر پانچ برس صرف ہوئے۔اب یہ رائج ہو چکے ہیں۔

دوسرے ضمیمے پر اردو کلیدی تختہ ہے جو مقتدرہ قومی زبان کی طرف سے معیار بند کیا گیا ہے۔ یہ کلیدی تختہ نادرا کے زیر استعمال ہے اور جزوی طور پر مائیکروسافٹ کے انگریزی کے ونڈوز ایکس پی اور اردو کے ونڈوز ایکس پی میں شامل ہے۔

تیسرے ضمیمے میں یونی کوڈ پر موجود عربی حروف کا صفحہ ورژن نمبر ۳ دیا گیا ہے۔ جس میں مقتدرہ کی طرف سے تبدیلی ورژن نمبر ۴ میں واضح ہے۔ اس تبدیلی میں علاماتِ صفر، شاعر، حوالہ، درود و تقدیس کی علامات اور خالی (Ghost) کشتیاں یا حروف شامل ہیں۔ جن سے نقاط کی بغیر قرآن اور دیگر عبارات کی لفظ کاری ممکن ہو گئی ہے۔ خالی نقاط کی بحث یونی کوڈ کے ساتھ جاری ہے جو مرکز فضیلت کی ویب سائٹ www.nlauit.gov.pk پر دیکھی جا سکتی ہے۔

چوتھے ضمیمے میں یونی کوڈ پر موجود ساٹھ رسومِ خط کے نام دیے گئے ہیں۔ ان میں سے پچاس کو باقاعدہ ضابطہ صفحات حاصل ہوئے ہیں اور ان میں سے ۴۳ جدید رسومِ خط ہیں۔ نستعلیق ان میں کہیں شامل نہیں کیونکہ اسے غلطی سے نسخ کا ذیلی سیٹ سمجھا جاتا ہے جبکہ اس کا ترسیمہ ح، م، ی کے حوالے نیز نشست اور مقام کے حوالے سے مختلف ہوتا ہے۔ اردو کو ویسے بھی عربی کا ذیلی سیٹ ہی سمجھا جاتا ہے۔

پانچویں ضمیمے میں سادہ جملوں کا فارمولا دیا گیا ہے جو چومسکی کے نقطہ نظر سے وضع ہوتا ہے۔

چھٹے ضمیمے میں ترجمے کے لیے مرکب جملوں کا بنیادی فارمولا، اس کی ترتیب نو کے مسائل کے ساتھ دیا گیا ہے۔

ساتویں ضمیمے میں اردو کوائفیہ میں معلومات داخل کرنے کا فارم شامل ہے۔

آخری تینوں ضمیموں سے کمپیوٹر کے لیے اردو قواعد کی ورکشاپ اسلام آباد ۹ تا ۱۱ مارچ ۲۰۰۷ء میں بنیادی کام لیا گیا تھا اور انھیں حتمی شکل دی گئی ہے۔ جس کی بنیاد پر مشینی ترجمے اور اردو کوائف کے سافٹ ویئر تیار کیے جا رہے ہیں۔

اردو کو اس کے ابلاغی پہلوؤں سے تکنیکی ترقی کے تیز تر عمل میں شامل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ادب، صحافت اور میڈیا کے متعلقہ لوگ ان گزارشات پر مفصل غور کریں جنھیں بے حد اختصار کے ساتھ یہاں پیش کیا گیا ہے۔

یہ کام ہو رہے ہیں یا ہو جائیں گے لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ اردو کے سلسلے میں تدریس اور نصابات کا رخ موڑا جائے۔ ہماری تحریک پر ۲۰۰۳ء سے ہائر ایجوکیشن کمیشن نے اردو کے اعلیٰ سطحی نصاب میں تبدیلیاں کی ہیں اور اردو اطلاعیات کو اس کا حصہ بنایا، مگر ابھی تک کسی یونیورسٹی کے شعبہ اردو نے اس پر عمل شروع نہیں کیا۔ اردو لسانیات کی تدریس کا بھی کہیں آغاز نہیں ہوا۔ پھر اردو کے ماہرین کمپیوٹری لسانیات کہاں سے آئے؟ اردو کے مختلف متون اور ادبی مخزنات کے تجزیے کہاں چھپیں گے۔ شعبہ ہائے اردو تو ماضی پرستی میں مست اپنی بقیہ زندگی بسر کرنے میں مصروف ہیں۔ حال کی اردو اور مستقبل کی ضرورتوں پر کون تحقیق کرے گا؟ یہ تحقیق سائنسی بنیادوں پر کرنے کی ضرورت ہوگی۔ تحقیقی منصوبوں کے لیے رقم کی کوئی کمی نہیں مگر یہ کام کہاں انجام پائے گا اور یہ جو کام ہو رہے ہیں ان کی تدریس کہاں ہو پائے گی۔ ایک ادارہ کافی نہیں۔ اردو اطلاعیات کا شعبہ قائم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے مگر باد مخالف کی سم آلودگی؟

ضمیمہ: ۴

یونی کوڈ کے ساٹھ رسومِ خط

دنیا میں اس وقت تک کمپیوٹر کے حوالے سے یونیکوڈ میں صرف ساٹھ رسومِ خط تسلیم کیے گئے ہیں:

۱۔لاطینی	۲۔یونانی	۳۔قبطی	۴۔سیرلی	۵۔گیلکولیتھی
۶۔آرمینیائی	۷۔جارجیائی	۸۔یونانی	۹۔عربی	۱۰۔شامی
۱۱۔تھانا	۱۲۔دیوناگری	۱۳۔بنگالی	۱۴۔گورمکھی	۱۵۔گجراتی
۱۶۔اڑیا	۱۷۔تامل	۱۸۔تلگو	۱۹۔کنڑی	۲۰۔ملیالم
۲۱۔سنہالا	۲۲۔تبتی	۲۳۔فاگس پا	۲۴۔لیمبو	۲۵۔سلوتی ناگری
۲۶۔خروشتی	۲۷۔تھائی	۲۸۔لاؤ	۲۹۔میانمار	۳۰۔خمیر
۳۱۔تائی لی	۳۲۔نئی تائی لیو	۳۳۔فلپائنی	۳۴۔بوگنی	۳۵۔بالینی
۳۶۔ہن(CJK)	۳۷۔بوپوموفو	۳۸۔ہیراگانا	۳۹۔کتاکانا	۴۰۔ ہنگول
۴۱۔یی	۴۲۔ایتھوپیائی	۴۳۔ منگولیائی	۴۴۔عثمانیہ/صومالی	۴۵۔ٹفی ناغ
۴۶۔ این کو	۴۷۔شیروکی	۴۸۔کینیڈا قدیم	۴۹۔صحرائی	۵۰۔شاوین
۵۱۔اوغم	۵۲۔قدیم اطالوی	۵۳۔رونی	۵۴۔گوتھی	۵۵۔لائنر
۵۶۔کیپریوٹ	۵۷۔فونیقی	۵۸۔ اگاریتی	۵۹۔قدیم پارسی	۶۰۔سامری/اکادی

تبصرے

MAKHZAN QAUMI URDU CONFERENCE

INAYATULLAH

In 1901, by starting Makhzan, an Urdu journal of great promise and repute, Sir Abdul Qadir blazed a new trail in the Indian literary world. Such luminaries as Allama Iqbal Mujnoo Gorakpuri and Yaldram (father of famous novelist Qurratulain Haider) regularly wrote for it, contributing poems and articles. One of Iqbal's great poems titled Himala (Himalays) was published in one of the earlier issues. Sir Abdul Qadir himself wrote essays and other features aimed at enlightening the readers of the rapid strides being made by the western world in various fields. Soon enough, Makhzan found a niche for itself by setting a standard for other literary periodicals. Exactly one hundred years later, Makhzan was published by the Quaid-e-Azam library, located in Bagh-e-Jinnah, Lahore under the editorship of the renowned Urdu scholar Dr. Waheed Qureshi. Its board of editors include such eminent writers as Intizar Hussain, Dr. Saleem Akhtar, Dr. Anwar Sadeed and Amjad Islam Amjad. 12 issues of it containing a large number of research articles, have come out so far. The journal has been hailed within the country and abroad especially in India as a leading literary offering.

Earlier this month the Makhzan board of editors held a national conference at the Quaed-i-Azam Library, on the place and future of Urdu in Pakistan. Mr. Muhammad Mian Soomro Chairman Senate was the chief guest while the first session was chaired by the doyen of Urdu literary critics Dr. Jamil Ahmad Jalibi.

Known Urdu scholars and researchers were invited from all over the country - from Islamabad, all the four provinces and Azad Kashmir. Mehtab Akhtar Rashdi and Dr. Jalibi represented Sindh, Dr. Khatir Ghaznavi and Mohsin Ehsan came from NWFP. Mr. Abdul Hakim Baloch and Dr. Firdos Anwar Qazi, (dean of faculty of language and literature at the University of Balochistan) spoke for Balochistan. Azad Kashmir was represented by Zaheer Javed (son of Maulana Charagh Hassan Hasrat) and Dr. Shaheen Mufti. Dr. Fateh Muhammad Malik, chairman of the Urdu Language Authority could not make it because of pressing official engagements but sent a paper for the conference. His paper was read by a renowned Urdu writer Dr. Saleem Akhtar. Dr. Attash Durrani a leading specialist at the Urdu Language Authority, read his masterly research paper on Urdu, information technology and media. Dr. Shahzad Ahmad expressed his views on Urdu and the new knowledge. Dr. Anwar Sadeed made a scholarly presentation on Urdu in Punjab. Dr. Sohail Ahmad, dean of the faculty Government College Lahore University also addressed the

conference.

The most noticeable and gratifying feature of the conference presentations was that scholars coming from different parts of the country laid the claim that their respective province was the birth place of Urdu. In this connection the findings of the paper-writers from Sindh, NWFP and Punjab were amply backed by credible evidence.

Dr. Khatir Ghaznavi for instance elaborately established that the origin of Urdu can be traced to Hindko.

Rashdi referred to Suleman Nadiv's research and Pir Hisamuddin Rashdi's conclusion that Urdu's formative phase directly related to Sindh, after the arrival of Muslims. She mentioned the holding of festivals in Khairpur and Larkana celebrating the birth of Urdu. I consider, said Mehtab that Urdu was in the "Khameer" of Sindh and presently is a part of its "Zameer." Dr. Anwar Sadeed, an acknowledged literary critic, cited research findings of scholars establishing that the origins of Urdu were to be found in the Punjab. He especially focused on the well known master study undertaken by Professor Muhammad Shirani. Dr. Fateh Muhammad Malik was of the view that Urdu was a refined form of Punjabi. (His remarks about the Indian Punjab's advocacy for the propagation of the Punjabi language for use in schools and for other purposes in Pakistan Punjab was not liked by a section of the audience). Dr. Shahzad stressed the need for narrowing the gap between the strides made in various fields of knowledge and Urdu. He pleaded for the transfer of new knowledge in our languages with special reference to technical terms.

Dr. Attash Durrani's research paper evoked a lot of interest and applause. His contributions as a senior functionary in the Urdu Language Authority include the transformation of Microsoft Windows XP and office 2003 into Urdu. You won't need Roman script, any more for the website or Email for Urdu, he claimed. Out of 4000 languages world wide, only 26 are being used on the internet and Urdu is now one of them. An automatic translation system too is under preparation. Dr. Sohail Ahmad Khan dilated on the rapidly declining book reading habits amongst the new generation and how this deficiency can be met keeping in view the demands of the changing times.

Mr. Muhammad Mian Soomro Chairman Senate, in his inaugural address, acknowledged the status of Urdu as the national language. As head of the Senate, he represents the federation of Pakistan. Most welcome was his promise to personally help implementation of the constitutional provision that asks for the enforcement of Urdu as the official language of Pakistan. Here it may be appropriate to reproduce article 251 of the Constitution:

"National Language:-(1) The National language of Pakistan is Urdu, and arrangements shall be made for its being used for official and other purposes within fifteen years from the commencing day.

(2) Subject to clause (1), the English language may be used for official purposes until

arrangements are made for its replacement by Urdu.

(3) Without prejudice to the status of the national language, a Provincial Assembly may by law prescribe measures for the teaching, promotion and use of a Provincial language in addition to the national language."

No one in this day and age, can underestimate the importance of English as the international language of diplomacy science, economics and media. Its acquisition is of great value and advantage. And there should no let up in teaching this global vehicle of communication. At the same time the importance and status of a national language has to be fully acknowledged. Urdu is a rich language and is growing all the time. It has the resilience and capacity to cope with the new challenges and move with the times. Yes, the gaps between it and the rapidly increasing new ideas and burgeoning communication technologies has to be filled in with speed and competence.

Urdu is widely spoken and understood all over the country. In what constitutes Pakistan today all its parts are keen to claim its origin as mentioned above with reference to the scholars' findings.

If Japan, Korea, Russia and China can make phenomenal progress in all spheres of life using their own languages for instruction, administration and scientific research and technology, there is no reason not to use and adopt Urdu for official and other purposes. It is not generally understood that Urdu (spoken and understood as it is all over the country), by becoming the official language, will contribute a great deal towards strengthening of the federation.

According to our Constitution Urdu was to start being used as an official language by the year 1988. It is now 34 years and we are still dilly-dallying with the constitutional imperative.

Appropriately the conference recommended that the Urdu must be enforced as the official language without any delay. It appreciated the prime minister's committee's observations in this respect.

Promotion and use of Urdu by no means will result in adversely affecting the importance and value of the regional and provincial language. We should be proud of having them and must work for their development. Fortunately Urdu and all our regional or provincial languages have a common script.
These wonderful instruments of communication together serve to enrich our culture. We must recognize the need for unity in diversity.
(The Nation, May 12,2007)

مخزن قومی اردو کانفرنس

چاروں صوبوں سے شریک مندوبین نے اردو کو فوری طور پر سرکاری زبان بنانے کا مطالبہ کیا

رؤف ظفر

گزشتہ دنوں قائد اعظم لائبریری کے مجلّہ مخزن کی مجلس ادارت کے زیر اہتمام قومی اردو کانفرنس کا انعقاد ہوا جس کا موضوع "پاکستان میں اردو کا مستقبل" تھا۔ اس ایک روزہ کانفرنس کے افتتاحی اجلاس کی صدارت معروف ادیب ڈاکٹر جمیل جالبی نے کی جب کہ مہمان خصوصی سینٹ کے چیئرمین میاں محمد سومرو تھے۔ اس کانفرنس کے ایک روز میں تین سیشن ہوئے اور مجموعی طور پر ۱۸ ماہرین نے مختلف موضوعات پر ۱۳ تحقیقی مقالے پڑھے جنہیں سامعین کے لیے فہم کرنا خاصا مشکل کام تھا لیکن جیسا کہ منتظمین نے بتایا کہ یہ تمام مقالے بعد ازاں مجلّے میں شائع کیے جائیں گے، اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ماہرین علم و ادب کے ان تحقیقی مقالوں سے یقیناً استفادہ کی کوئی صورت نکل آئے گی۔ پہلے سیشن کی کمپیئرنگ امجد اسلام امجد نے کی جبکہ باقی اجلاس کی شہباز مزمل نے کی جو کہ پروگرام آرگنائزر بھی تھیں۔ خطبہ استقبالیہ مخزن کی مجلس ادارت کے چیئرمین عنایت اللہ نے پیش کیا۔ تین نشستوں پر مشتمل اس کانفرنس میں جن دانشوروں، علمی و ادبی ماہرین اور محققین نے مقالے پیش کیے ان میں ڈاکٹر جمیل جالبی، پروفیسر فتح محمد ملک، مہتاب اکبر راشدی، شہزاد احمد، محسن احسان، عبدالحکیم بلوچ، ڈاکٹر خاطر غزنوی، ڈاکٹر انور سدید، فردوس انور قاضی، ڈاکٹر شاہین مفتی، ڈاکٹر عطش درانی، ڈاکٹر سہیل احمد خان اور ظہیر جاوید شامل تھے۔ تقریب میں ایڈیشنل چیف سیکرٹری پنجاب نجیب اللہ ملک بھی شریک تھے۔

پہلی نشست کا مقالہ ڈاکٹر فتح محمد ملک کا تھا جو خود نہ آ سکے۔ اس لیے ان کا مقالہ ڈاکٹر سلیم اختر نے پڑھ کر سنایا۔ انہوں نے کہا کہ یہ بحث ایک صدی پرانی ہے کہ اس خطے میں پنجابی زبان بولی جائے یا اردو، تاہم حافظ محمود شیرانی نے تحقیق سے یہ ثابت کیا ہے کہ پنجابی بطور مادری زبان، کی تجویز سو سال پہلے رد کر دی گئی تھی اور پنجاب کے مسلمانوں نے انگریزوں کی سازش کو ناکام بنا دیا تھا۔ مقالے میں ڈاکٹر فتح محمد ملک نے یہ ثابت کیا کہ اردو پنجابی ہی کی ایک منجھی ہوئی عالمی و ادبی ترقی یافتہ شکل ہے۔ انہوں نے اس پرانی بحث کے کئی دلچسپ اقتباسات پیش کیے جو نصف صدی قبل "پیسہ اخبار" میں شائع ہوتے رہے تھے۔

سینٹ کے چیئرمین محمد میاں سومرو نے اردو کو وفاق اور اتحاد کی علامت قرار دیا اور کہا کہ سرکاری سطح پر اردو یونیورسٹی کا قیام اور وزیر اعظم پاکستان شوکت عزیز کی طرف سے اردو کو سرکاری و عدالتی زبان کے طور پر اختیار کرنے کے لیے ایک کمیٹی کا قیام ایک اہم قدم ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے کہا کہ انگریزی زبان سیکھنا اور پڑھنا ایک بات ہے لیکن اسے اوڑھنا بچھونا بنا لینا دوسری بات۔ ہمیں اپنے اوپر انگریزی مسلط نہیں کرنی چاہیے۔ اپنی قومی زبان سے لاپرواہی برت کر ہم مشرق اور مغرب کے درمیان معلق ہو کر رہ گئے ہیں۔ انہوں نے کہا برصغیر میں تحریک آزادی کا پیغام اردو زبان میں ہی لوگوں تک پہنچایا گیا تھا۔ اس وقت قومی اتحاد و یکجہتی کا تقاضا ہے کہ قومی زبان اردو کو فروغ دیا جائے۔

مہتاب اکبر راشدی نے سندھ میں اردو کے عنوان سے مقالہ پڑھتے ہوئے کہا کہ سندھی اور اردو زبانوں کی صوتی،

صرفی اورنحوی تراکیب یکساں ہیں۔اردو کی تولید کے جو تین منابع تسلیم کیے گئے ہیں ان میں دکن اور پنجاب کے علاوہ سندھ بھی شامل ہے۔اردو دنیا کے ۱۳۶ اہم ترین ممالک میں بولی جاتی ہے۔انہوں نے کہا کہ پورے برصغیر میں کہل، ترنگ اور جامعیت کے لحاظ سے اردو کی کوئی مثال نہیں۔پروفیسر محسن احسان نے سرحد میں اردو کے عنوان سے مقالہ پڑھتے ہوئے کہا کہ چار کروڑ آبادی والے صوبہ سرحد میں اگرچہ مختلف بولیاں بولی جاتی ہیں لیکن اردو سمجھنے اور بولنے والے ہر جگہ موجود ہیں۔انہوں نے خاطر غزنوی کی اس تحقیق سے اتفاق کیا کہ ہندکو کا ماخذ اردو زبان ہے۔انہوں نے کہا "اردو کی ترویج و ترقی میں سرحد کا حصہ کسی دوسرے صوبے سے کم نہیں"۔ڈاکٹر انور سدید نے "پنجاب میں اردو" کے موضوع کے حوالے سے کہا کہ اردو مسلمانوں اور ہندوؤں کے معاشرتی امتزاج کا خوبصورت ثمر ہے۔شیر علی خان سرخوش کی تحقیق کے مطابق اردو کی نہایت ابتدائی شکل پنجابی ہے۔مولانا صلاح الدین احمد کا کہنا ہے کہ پنجابی ماں ہے اور اردو پنجاب کی بیٹی ہے۔قومی زبان و ادب کے ارتقاء میں پنجاب کے کردار کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

جناب حکیم بلوچ نے بلوچستان میں اردو کے حوالے سے کہا کہ ۱۹ویں صدی میں جب مہریار خان رند ایرانی سپاہ کے دوش بدوش کالن پہنچے تو اردو کو بلوچستان لائے۔غالب نے ایک بلوچی شاعر گل محمد ناطق کو جو اردو میں بھی شاعری کرتے تھے، اپنا دیوان بھجوایا تھا۔۱۹۷۲ء میں جب بلوچستان میں عوامی نمائندہ حکومت قائم ہوئی تو اردو کو دفتری زبان قرار دیا گیا۔انہوں نے کہا اردو کو پاکستان کی مملکتی زبان قرار دے کر قائداعظم کے خواب کو شرمندہ تعبیر کرنا چاہیے۔

جناب ظہیر جاوید نے کشمیر میں اردو کے عنوان سے مقالہ پڑھا اور کہا کہ جموں میں ڈوگری، پونچھ میں پہاڑی، وادی میں کشمیری، گلگت میں شینا اور لداخ میں لداخی بولنے والوں کو اگر کسی زبان نے رابطے کی لڑی میں پرویا تو یہ اردو زبان تھی۔شہزاد احمد نے اردو اور جدید علوم کے حوالے سے کہا کہ اردو کو سرکاری زبان بنانے کا کام شاید سردخانے میں ڈال دیا گیا ہے۔نوجوانوں کو جان بوجھ کر اردو سے دور رکھا جا رہا ہے۔انہوں نے کہا کہ مغرب نے علوم کا ڈھیر لگا دیا ہے ان سب کو اردو میں منتقل کیا جانا ضروری ہے۔

کانفرنس سے انتظار حسین، ڈاکٹر خاطر غزنوی، ڈاکٹر فردوس انور قاضی، ڈاکٹر شاہین مفتی، ڈاکٹر عطش درانی، ڈاکٹر سہیل احمد خان اور چیف لائبریرین محمد تاج صاحب نے بھی خطاب کیا اور کہا کہ اگر پاکستان کے مختلف حصوں کو متحد ہو کر ترقی کے راستے پر گامزن ہونا ہے تو اس کا واحد ذریعہ اردو کا بطور سرکاری اور عدالتی زبان کے نفاذ ہے جو گزشتہ دو دہائیوں سے کھٹائی میں پڑا ہوا ہے۔اگر ہمارے یہاں گزشتہ ساٹھ سال سے کوئی بڑا مفکر، سائنس دان یا دانشور پیدا نہیں ہوا تو اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ ہم نے اپنی قومی زبان سے بے اعتنائی اختیار کر لی ہے۔کانفرنس کے مندوبین نے اس امر سے اتفاق کیا کہ الیکٹرانک انقلاب اور گلوبل ویلج کے اس دور میں اردو کو بطور زبان جتنے چیلنج آج درپیش ہیں اس سے پہلے کبھی نہ تھے۔ہمیں خوش فہمیوں سے نکل کر اس زبان کو نہ صرف اپنے ملک بلکہ پوری دنیا میں روشناس کرانے کے لیے سخت محنت کرنا ہوگی۔

(روزنامہ "جنگ" لاہور)

''مخزن قومی اردو کانفرنس''۔ قومی ضرورت

انور سدید

عروس البلاد لاہور میں ۵ مئی ۲۰۰۷ء کو ''مخزن قومی اردو کانفرنس'' کا انعقاد کسی فرد کا شوق نہیں تھا بلکہ یہ اہم ترین قومی ضرورت تھی۔ اس کا بنیادی مقصد آئین کی دفعہ ۲۵۱ کے تحت اور قائد اعظم کے مارچ ۱۹۴۸ء میں ڈھاکہ (سابق مشرقی پاکستان) میں فرمان کے مطابق قومی زبان اردو کا سرکاری نفاذ تھا۔ اس کی ڈیڈ لائن ۱۹۷۷ء تھی لیکن بیس سال تک جنرل ضیا الحق، بے نظیر بھٹو، میاں نواز شریف اور اب جنرل پرویز مشرف کی حکومتوں نے اغماض برتا اور انگریزی کو پہلی جماعت سے پڑھانے کی تجاویز پر عمل درآمد شروع کر دیا۔ لارڈ میکالے نے برطانوی دور میں انگریزی زبان ہندوستانیوں کو پڑھا کر کالے انگریز پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی تھی، اب اس زبان کو بالادستی عطا کر کے پاکستان کے مسلمان عوام کو ان کے قومی تشخص سے محروم کرنا تھا۔ لیکن واضح رہے کہ اردو کی آئینی حیثیت سے کبھی انکار نہیں کیا گیا۔ اور اتمام حجت کے لیے اس کے نفاذ کا تاثر بھی قائم رکھا گیا۔ چنانچہ ایک ۱۳ رکنی کمیٹی نے نفاذ اردو کے لیے سفارشات مرتب کیں جن کا جائزہ گزشتہ دنوں وزیر اعظم شوکت عزیز کی کابینہ کمیٹی نے لیا تا کہ وہ حتمی سفارشات کی حتمی منظوری کے لیے قومی اسمبلی کو بھیج دیں۔ اب یہ سفارشات وزیر اعظم صاحب کے پاس ہیں لیکن قومی اسمبلی میں پیش کرنے کی ڈیڈ لائن مقرر نہیں کی گئی، اس قومی اقدام اور قائد اعظم کے فرمان کی مخالفت میں جناب ڈاکٹر عطاء الرحمان اور خصوصی تعلیم کی وفاقی وزیر زبیدہ جلال پیش پیش بتائی جاتی ہیں جو انگریزی کو پرائمری درجے سے نافذ کرنے کی حامی ہیں، قائد اعظم لائبریری کے اردو مجلّہ ''مخزن'' کی مجلس ادارت کے سربراہ جناب عنایت اللہ نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور نفاذ اردو کی مہم کو تیز تر کرنے کے لیے ایک کانفرنس لاہور میں منعقد کرنے کی تجویز پیش کی۔ کیونکہ لاہور ۱۱۲۱ء سے اردو زبان کا مرکز ہے جب مسعود سعد سلمان نے پہلا دیوان مرتب کیا تھا۔

واضح رہے کہ جناب عنایت اللہ ملک کے ایک نامور دانشور اور اردو زبان و ادب کے شیدائی ہیں، قدرت اللہ شہاب، مسعود مفتی، اعجاز فاروقی، الطاف گوہر، ضیا جالندھری، شفیق الرحمان، طارق محمود، شوکت علی شاہ، محمد سعید شیخ، مرتضٰی برلاس، شیخ منظور الٰہی اور مختار مسعود صاحب کی طرح وہ اعلیٰ سرکاری افسر ضرور تھے لیکن اردو ان کی پہلی محبت تھی۔ انہوں نے بیوروکریسی میں شامل ہونے والے نئے افسروں کو اردو میں تربیت بھی دی۔ انہوں نے پاکستان اکیڈمی برائے انتظامی امور کے تحت رسالہ ''نظم و نسق'' ۱۹۸۰ء میں جاری کیا جس میں فکری اور نظریاتی مضامین انہوں نے خود لکھے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر وحید قریشی، نبی بخش بلوچ، ڈاکٹر سمیع قریشی، اعجاز فاروقی، پریشان خٹک، ڈاکٹر محمد عارف، احمد ندیم قاسمی، عبدالسلام خورشید، ڈاکٹر عبادت بریلوی اور ممتاز حسن جیسے نامور ادیب اس رسالے میں باقاعدگی سے لکھتے تھے۔ اس رسالے کا مقصد ہی ترویج و فروغ زبان اردو تھا اور اس کی تحسین ڈاکٹر سید عبداللہ

نے دل کھول کر کی۔عنایت اللہ صاحب نے مسلسل آٹھ سال تک "تعلیم مسلسل" کے نام سے بھی ایک رسالہ اردو میں شائع کیا جس میں علوم نو کا تعارف اردو میں کرایا جاتا تھا۔ایک سو سال کے بعد اردو کی جنم بھومی لاہور سے رسالہ "مخزن" کا چوتھی بار اجرا کا خیال بھی عنایت اللہ صاحب کے ذہن میں پیدا ہوا اور اس کی ادارت کے لیے انہوں نے ممتاز محقق اور نقاد ڈاکٹر وحید قریشی کا نام تجویز کیا اور مجلس ادارت میں انتظار حسین، ڈاکٹر سہیل احمد، ڈاکٹر سلیم اختر، امجد اسلام امجد، ڈاکٹر طاہر تونسوی اور اس ناچیز انور سدید کو قائداعظم لائبریری کی انتظامیہ نے نامزد کیا۔عنایت اللہ صاحب کو ان کی انتظامی اور ادبی صلاحیتوں کی اساس پر چیر مین مقرر کیا گیا۔انہوں نے "مخزن" کو شیخ عبدالقادر (مدیر اول) کی طرح اسے اردو ادب کا صحیح نمائندہ بنانے کی کاوش کی۔جو قابل صد تحسین ہے۔

جناب عنایت اللہ وسیع المطالعہ اور صاحب نظر نقاد ہیں، ایک ادبی مجلس میں انہوں نے "علامہ اقبال اور قائداعظم" کے موضوع پر مقالہ پڑھا تو اس محفل میں جناب مجید نظامی موجود تھے۔وہ انہیں اپنے ساتھ "نوائے وقت" کے دفتر میں لے گئے۔چائے پیش کی، اور ان کا مقالہ "نوائے وقت" میں شائع کیا۔عنایت اللہ صاحب کے متعدد تبصرے "مخزن" میں شائع ہو چکے ہیں۔ان کا خیال افروز سیاسی کالم انگریزی اخبار "دی نیشن" میں ہر ہفتے چھپتا ہے اور حزب اختلاف کا کردار ادا کرتا ہے۔میں نے یہ تفصیل اس لیے پیش کی ہے کہ ایک اخبار میں ۷ نومبر ۲۰۰۱ء کے شمارے میں کالم "لاہوریات" میں ان کا ذکر مجھے اس اخبار کے مزاج اور صحافتی اقدار کے مطابق محسوس نہیں ہوا۔ شاید محترم کالم نگار جناب عنایت اللہ کے نام، کام اور اعلیٰ علمی، ادبی، صحافتی اور تہذیبی خدمات اور شخصیت سے واقف نہیں۔ واضح رہے کہ جناب عنایت اللہ ایک درویش صفت انسان اور ایثار پیشہ پاکستانی ہیں اور نام و نمود سے بے نیاز ہو کر اردو کی خدمت کر رہے ہیں۔اس عالی شان کانفرنس میں بھی وہ نمایاں نہیں ہوئے لیکن اس کی کامیابی ان کی مرہون منت ہے۔

متذکرہ کالم نگار نے اخبار کے قارئین کو یہ نہیں بتایا کہ اس کانفرنس میں کیا کہا گیا۔صدر محفل ڈاکٹر جمیل جالبی نے کہا "برطانوی سامراج میں جس زبان نے آزادی کی تحریک کا پیغام نیچے سے اوپر تک پہنچایا وہ اردو تھی اور مشترکہ زبان کے بغیر کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی"۔مہمان خصوصی محمد میاں سومرو (چیئرمین سینٹ) نے کہا کہ اردو قدیم زبان ہے۔سومروؤں کی راجدھانی ٹھٹھہ (سندھ) پر محمد تغلق اور فیروز تغلق نے جب حملہ کیا تھا تو اس زمانے میں وہاں اردو بولی جاتی تھی۔مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد کے صدر نشین فتح محمد ملک نے "پنجاب کی مادری زبان اردو ہے" کے موضوع پر مقالہ لکھا جو حافظ محمود شیرانی کے نظریے سے مشتق تھا۔یہ مقالہ ڈاکٹر سلیم اختر نے پڑھا۔سندھ سے جناب ابا کیر راشدی تشریف لائی تھیں۔انہوں نے کہا "اردو پہلے ہمارے خمیر میں تھی، اب ہمارے ضمیر میں ہے۔"محسن احسان صاحب نے فرمایا: "صوبہ سرحد کو یہ فخر بھی حاصل ہے کہ اردو کو سرکاری طور پر وزیر اعلیٰ نے ایک نوٹیفیکیشن کے ذریعے دفاتر میں نافذ کر دیا ہے۔"بلوچستان کے دانشور جناب عبدالحکیم نے کہا کہ ہم سب فیصلہ کر لیں کہ اردو کو لشکر کے خطوط پر نہیں بلکہ تہذیبی و لسانی خطوط پر پاکستان کی دوسری زبانوں کو ساتھ لے کر آگے بڑھیں گے اور اردو کو پاکستان کی سرزمین کی مملکتی زبان بنا کر بانی پاکستان کے خواب کو حقیقت میں بدل دیں گے۔"جناب شہزاد احمد، ناظم مجلس ترقی ادب لاہور کی رائے میں

”کئی زبانیں ایسی ہیں جو اپنی قومی زبان میں بنیادی سائنسی کام کر رہی ہیں۔ یہ کام اردو میں بھی کیا جا سکتا ہے۔“ بلوچستان کی ڈاکٹر فردوس انور قاضی صاحبہ نے کہا ”اردو پاکستان کی واحد زبان ہے جو چاروں صوبوں میں یکساں سمجھی اور بولی جاتی ہے۔ اس کو تعلیمی اور سرکاری زبان بنائے بغیر ترقی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔“ ظہیر جاوید نے دعویٰ کیا کہ ”دکن، دہلی، لکھنؤ اور لاہور کے ساتھ ساتھ کشمیر کو بھی دبستانِ اردو کا مقام حاصل ہے۔“ ڈاکٹر خاطر غزنوی نے کہا ”اردو ۱۰۲۷ء کے لگ بھگ لاہور میں پیدا ہوئی۔ قدیم پنجابی اس کی ماں ہے۔ اردو پنجابی بولی کا ترقی یافتہ روپ ہے۔“ ڈاکٹر شاہین مفتی نے انفرمیشن ٹیکنالوجی اور میڈیا کی یلغار میں اردو کی بے بسی کا ذکر کیا لیکن ڈاکٹر عطش درانی نے خوشخبری دی کہ کمپیوٹر سکرین کو اردو میں بدل دیا گیا ہے اور بہت جلد متعدد زبانوں کو اردو میں ترجمہ کرنے کے ”سافٹ ویئر“ تیار ہو جائیں گے۔ انور سدید نے پنجاب کے تخلیقی ذہن کی انفرادیت کا ذکر کیا اور کہا آزادی کے بعد پنجاب سے بھارت میں جانے والے ادیبوں نے بھارت کے ادب کو بھی منقلب کر دیا۔

متذکرہ بالا کالم نگار کو ضرور علم ہو گا کہ بین الاقوامی کانفرنسوں میں مقالات کا خلاصہ پڑھا جاتا ہے، پورے مقالات بعد میں چھاپے جاتے ہیں۔ اس کانفرنس میں بھی یہ طریق ہی اختیار کرنا ناگزیر تھا۔ چنانچہ ایک دن میں بارہ مقالات پیش کیے گئے اور کھانے اور چائے کے وقفوں کے باوجود کانفرنس میں وقت کی مثالی پابندی کی گئی۔ بیرون لاہور سے نو مہمان آئے تھے جنھیں کسی مہنگے ہوٹل میں ٹھہرانے کی بجائے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے مہمان خانے میں ٹھہرایا گیا۔ مقالہ نگاروں کے نام اوپر آ چکے ہیں اور یہ سب اردو ادب کے مستند نام ہیں اور انہوں نے اردو کے مقاصد کی نگہبانی عمر بھر کی ہے اور کبھی علاقائی عصبیت کا اظہار نہیں کیا۔ مجموعی طور پر اردو کے مستقبل پر کامیابی کا تاثر پیدا ہوا اور متفقہ قرارداد کے ذریعے اردو کو فوری طور پر نافذ کرنے اور آئین کے تقاضے پورے کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ بیرونی ممالک میں کتابیں بھیجنے پر شرح ڈاک کے بہت زیادہ اضافے پر تشویش ظاہر کی گئی اور ۲۰۰۰ء کی شرح نافذ کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ ”مخزن“ کی مجلس ادارت نے اردو کے نفاذ کے مقاصد کو آگے بڑھانے کا فیصلہ کیا اور سامعین سے تعاون کی اپیل کی۔

کانفرنس کی اس مختصر رپورٹ سے اس کی کامیابی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جبکہ تینوں نشستوں میں سامعین کی بہت بڑی تعداد نے شرکت کی اور کوئی کرسی خالی نہیں دیکھی گئی۔ حق یہ ہے کہ ایک لمبے عرصے کے بعد لاہور میں ایسی بامقصد قومی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں قائداعظم محمد علی جناح کے لسانی نظریے اور اردو زبان کی پاسبانی پر چاروں صوبوں کے دانشوروں نے عمل کرنے کا عہد کیا اور واضح کر دیا کہ اردو تمام علاقائی زبانوں کی معاون ہے۔ ان زبانوں اور بولیوں سے استفادہ کرتی ہے۔ لیکن انگریزی کی بالادستی کو قبول نہیں کرتی۔

(روزنامہ نوائے وقت۔ لاہور)

حافظ صفوان محمد چوہان کا خط بذریعہ ای میل

محترم جناب عنایت اللہ صاحب، السلام علیکم

اللہ کی ذات سے امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔

مجھے ''مخزن قومی اردو کانفرنس'' منعقدہ ۵/مئی ۲۰۰۷ء میں اپنے دو احباب کے ہمراہ شرکت کا موقع ملا۔ میرا شعبہ کمپیوٹر اور اِنٹرنیٹ کے اِنتظام و انصرام کا ہے۔ اردو سے میرا تعلق مرحوم پروفیسر عابد صدیق صاحب کا بیٹا ہونے، ایک پاکستانی اور کسی حد تک زبان کے بارے میں معلومات کا مذاق رکھنے والے ایک قاری کا ہے۔ اِس کانفرنس کے کارفرماؤں کی محبت ہے کہ اُنھوں نے معروف معنوں میں اردو کے یگانوں کو ہی نہیں بلکہ ہم جیسے ''بے پڑھوے بیگانوں'' کو بھی شرکت کی دعوت دی۔

ہم اِنٹرنیٹ کی دنیا میں رہنے والے لوگ دنیا سے حقیقی رابطہ کمزور کر بیٹھتے ہیں۔ یہ کہیے کہ ہماری ہمہ وقتی معروفیت کچھ ایسی ہو جاتی ہے کہ اگرچہ ہم ساری دنیا سے فقط انگلیوں کی ذرا سی حرکت سے رابطے میں آ جاتے ہیں لیکن جسمانی اعتبار سے بالعموم اپنے قریب کے لوگوں اور اُن کی خبروں سے بالکل یکسو ہو جاتے ہیں۔ آپ اِسے ہماری پیشہ ورانہ مجبوری کہہ لیجیے یا کم سوادی، لیکن حقیقت یہی ہے۔ ایسے حالات میں جب کوئی تقریب ایسی بن جائے جس میں زندہ قومی اور علاقائی مسائل پر بات ہوتی ہو، ہمارے لیے زندگی سے تعلق قائم کرنے کا بہانہ بن جاتا ہے۔ ہم میں سے کچھ اِن مواقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ مخزن کی یہ کانفرنس ہم اِنفارمیشن ٹیکنالوجی (اطلاعیات) کی دنیا کے باشندوں کے لیے زندگی کا ایسا ہی فرحناک پیغام لے کر آئی اور یوں ہمیں مشینوں کے ماحول سے نکل کر زبان و ادب کی فضا میں چند سانس لینے کا موقع مل گیا۔

کانفرنس میں بڑے بڑے اہلِ علم نے پُرمغز مقالے پڑھے۔ سبھی مقالات اپنی اپنی جگہ جامع اور یکدانہ تھے لیکن میں پروفیسر فتح محمد ملک (جن کا مقالہ ڈاکٹر سلیم اختر نے پڑھا)، ڈاکٹر انور سدید، شہزاد احمد اور ڈاکٹر عطش درانی کے مقالات کے ساتھ ساتھ جناب محمد میاں سومرو، ڈاکٹر جمیل جالبی اور جناب انتظار حسین کے خطباتِ صدارت کی گہرائی اور گیرائی کا ذکر خاص طور سے کروں گا۔ اردو کی ایک پرانی کہاوت ہے: ''یا کرے دردمند یا کرے غرض مند؛'' آج جب کہ اردو کی بنیاد کو نا اُستوار کرنے اور اِس کے شعر و ادب کے سرمائے کو فرسودہ بتا کر مَیا میل کرنے کی سمت بند کوششیں اندر خانہ ہو رہی ہیں اور اِس کا عمومی حال یہ ہے کہ یارے نہ مددگارے، مجھے اِن سب مقالات و خطبات میں دردمندی اور اردو کی چلن داری کے لیے تڑپ اور غرض مندی، دونوں پہلو نظر آئے۔ انگریزی کے ایسے الفاظ کو جو بے جفت ہیں، اردوانا یا سیدھے سبھاؤ اردو میں داخل کر لینا کوئی عیب نہیں لیکن ''یا بے جہتی تیرا آسرا'' کے مصداق میڈیا پر اردو کی فرنگیت مآبی بہرحال تشویشناک فعل ہے۔

کانفرنس کے کامیاب اِنعقاد کے لیے آپ کی ساری ٹیم جائز طور پر مبارک باد کی حق دار ہے۔ محمد تاج صاحب کے پختہ کار انتظامی چھتنارے کے نیچے محترمہ شہناز مزمل کی کانفرنس کے معاملات کی پیش کاری اور جناب محمد توفیق کی تشریفات کے لیے بھاگا بھاگ ایسی چیزیں تھیں کہ سب شرکاء نے اِنھیں واضح طور پر محسوس کیا۔

اِس امر کا تذکرہ یہاں بے محل معلوم نہیں ہوتا کہ ڈاکٹر وحید قریشی صاحب، کہ میرے والد صاحب کے استاد بھی ہیں، مجھے مخزن کے لیے لکھنے پر لائے۔ یہ یکجہتی تعلق اور مخزن میں چھپنا، دونوں میرے لیے بڑے اِعزاز کی باتیں ہیں۔ اِس حوالے سے قایدِ اعظم لائبریری کے جناب اکرام الحق بھی رابطے میں رہتے ہیں۔ جناب محمد تاج کی کریم النفسی اور حوالے کی کتب کی فراہمی کے رسمی شکریے کے لیے بھی میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ اللہ اِن سب لوگوں کو بہترین جزائے خیر دے۔

قومی زبان کے حوالے سے اِس بہت اچھی اور دیر تک یاد رہنے والی کانفرنس کے اِنعقاد پر بارِ دِگر مبارک باد۔

بہ اِحترامات فراواں۔

والسلام

آپ کا

حافظ صفوان محمد چوہان

مقالہ نگاروں کا مختصر تعارف

ڈاکٹر جمیل جالبی

ڈاکٹر جمیل جالبی اردو ادب کے نقاد، محقق، ادبی مؤرخ، مترجم اور مفکر ہیں۔ علی گڑھ میں پیدا ہوئے۔ بی۔ اے کرنے کے بعد پاکستان آ گئے اور سندھ یونیورسٹی سے ایم اے، ایل ایل بی، پی ایچ ڈی اور ڈی لٹ کی ڈگریاں لیں۔ آپ نے انکم ٹیکس کمشنر، وائس چانسلر جامعہ کراچی اور صدر نشین مقتدرہ قومی زبان کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ ادب میں آپ کی حیثیت ایک اعلیٰ پائے کے محقق اور صائب الرائے نقاد کی ہے۔ آپ نے ۱۹۵۵ء میں پاکستان کلچرل سوسائٹی قائم کی۔ جس کے تحت اردو کا ادبی و تہذیبی سہ ماہی رسالہ ''نیا دور'' جاری کیا۔ ۱۹۵۸ء میں دیگر ادیبوں کے ساتھ پاکستان رائٹرز گلڈ کی بنیاد رکھی۔ آپ یورپ، امریکا، شرق اوسط اور شرق بعید میں منعقدہ متعدد تہذیبی و ادبی کانفرنسوں میں شرکت کر چکے ہیں۔ آپ کی تصنیفات میں ''پاکستانی کلچر'' (داؤد ادبی انعام یافتہ) ''تنقید اور تجربہ''، ''ایلیٹ کے مضامین''، ''ارسطو سے ایلیٹ تک''، ''مثنوی کدم راؤ پدم راؤ'' (داؤد ادبی انعام یافتہ)، قدیم اردو کی لغت (داؤد ادبی انعام یافتہ) اور تاریخ ادب اردو (تین جلد میں) دیوان حسن شوقی (ترتیب کلام نصرتی) ''جانورستان''، ''کلچر اور مسائل'' شامل ہیں۔

ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر انہیں ۱۹۶۴ء، ۱۹۷۳ء، ۱۹۷۴ء اور ۱۹۷۵ء میں داؤد ادبی انعام، ۱۹۸۷ء میں یونیورسٹی گولڈ میڈل، ۱۹۸۹ء میں نقوش ایوارڈ اور ۱۹۹۰ء میں ستارۂ امتیاز کا اعزاز ملا۔ ۱۹۹۴ء میں آپ کو نشانِ سپاس ملا۔

پروفیسر فتح محمد ملک

پروفیسر فتح محمد ملک اردو زبان و ادب کے ایک معروف نقاد اور ملک کے ممتاز دانشور ہیں۔ اقبالیات، علومِ اسلامیہ اور پاکستان سٹڈیز پر آپ کو عبور حاصل ہے۔ ان کے تحقیقی کام کو قومی اور بین الاقوامی طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ آپ کی ادبی تصنیفات میں سعادت حسن منٹو ایک نئی تعبیر، ''اپنی آگ کی تلاش''، ''احمد ندیم قاسمی شاعر اور افسانہ نگار''، ''فیض شاعری اور سیاست''، ''تحسین و تردید'' اور ''انداز نظر'' کے علاوہ اقبالیات پر ''اقبال کا فکری نظام''، ''اقبال فراموشی''، ''اقبال فکر و عمل''، ''اقبال اور افغانستان'' شامل ہیں۔ دیگر متنوع موضوعات پر چھپنے والی کتابوں میں ''خطۂ خاک یا ارضِ پاک''، ''غلاموں کی غلامی''، ''کشمیر کی کہانی''، ''فکری تنگ دستی''، "Punjabi Identity" اور "Islam and West" شامل ہیں۔ آپ نے متعدد کتب تدوین بھی کی ہیں۔ کئی نصابی کتب میں آپ کے مضامین شامل ہیں۔ ملک کے نامور جرائد میں آپ کے کئی تحقیقی مقالے شائع ہو چکے ہیں۔

آپ نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف پاکستان اسٹڈیز قائد اعظم یونیورسٹی اسلام آباد سے ڈائریکٹر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے

اوران دنوں مقتدرہ قومی زبان کے صدر نشین کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

محسن احسان

محسن احسان پشاور کے ایک خوشحال گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ۱۹۶۰ء میں درس وتدریس سے وابستہ ہیں۔آپ اسلامیہ کالج پشاور یونیورسٹی میں شعبہ انگریزی کے سربراہ کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔دنیا کے مختلف ملکوں میں جہاں اردو بولی، پڑھی، لکھی اور سمجھی جاتی ہے محسن احسان نے وہاں سیمینارز کانفرنسوں اور مشاعروں میں شرکت کی ہے۔ان کے شعری مجموعوں میں ''ناتمام''، ''ناگزیر''، ''ناشنیدہ''، ''نارسیدہ''، ''اجمل واکمل''، ''مٹی کی مہکار'' اور ''سخن سخن مہتاب'' شامل ہیں۔ان کو متعدد کتابوں پر ایوارڈ مل چکے ہیں۔سرحد کی سنگلاخ سرزمین سے اٹھنے والی یہ آواز اپنی انفرادیت اور جداگانہ اسلوب شعر کے حوالے سے پہچانی جاتی ہے۔

آپ کو حکومت پاکستان سے ۲۰۰۰ء میں ''پرائیڈ آف پرفارمنس'' مل چکا ہے۔آپ نے بچوں کے ادب میں بھی خاطر خواہ اضافہ کیا اوران کے لیے ''پھول پھول چہرے'' کے نام سے ایک کتاب شائع کی۔آپ نے دو انگریزی کتابوں All For Love اور Arms And The Man کے تراجم کیے جو چھپ چکے ہیں۔آپ پاکستان ٹیلی ویژن کے کمپیئر بھی ہیں۔

شہزاد احمد

شہزاد احمد ملک کے نامور شاعر، مترجم اور دانشور ہیں۔پنجاب یونیورسٹی سے ۱۹۵۲ء میں ایم اے نفسیات اور ۱۹۵۵ء میں ایم اے فلسفہ کی ڈگری حاصل کی۔گورنمنٹ کالج لاہور سے ''اکیڈیمک رول آف آنر'' حاصل کیا۔آپ کو آدم جی ایوارڈ، نقوش ایوارڈ برائے شاعری، علامہ اقبال ایوارڈ برائے شاعری، مسعود کھدر پوش ایوارڈ، صدارتی تمغہ حسن کارکردگی برائے شاعری مل چکا ہے۔آج کل مجلس ترقی ادب میں ڈائریکٹر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

آپ کے شعری مجموعوں میں ''صدف''، ''ادھ کھلا دریچہ''، ''بکھر جانے کی رُت''، ''ٹوٹا ہوا پل''، ''پیشانی میں سورج''، ''اترے مری خاک پر ستارا''، ''اندھیرا دیکھ سکتا ہے''، ''آنے والا کل''، ''جلتی بجھتی آنکھیں''، ''خالی آسمان''، ''دیوار پر دستک''، ''کون اسے جاتا دیکھے''، ''جاگن والی رات''، ''معلوم سے آگے''، ''ایک چراغ اور'' شامل ہیں۔آپ کی کتاب ''مٹی جیسے لوگ'' زیر طبع ہے۔آپ نے مختلف موضوعات پر متعدد کتب مرتب اور ترجمہ کی ہیں۔

مہتاب اکبر راشدی

مہتاب اکبر راشدی ریڈیو اور ٹی وی کی کمپیئر ہیں اور اعلیٰ سرکاری ملازم بھی رہیں۔آپ نوڈیرو (لاڑکانہ) میں پیدا ہوئیں۔ایم اے پولیٹیکل سائنس کرنے کے بعد جامشورو یونیورسٹی میں درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا اور یہیں سے سکالرشپ پر امریکا گئیں جہاں سے آپ نے انٹرنیشنل ریلیشنز میں سپیشلائزیشن کیا اور واپسی پر جامشورو یونیورسٹی میں دوبارہ درس وتدریس کا

سلسلہ شروع کیا۔ بعد ازاں سندھیالوجی ڈیپارٹمنٹ کی چیئرپرسن بھی رہیں۔ پانچ برس تک انسٹی ٹیوٹ آف سندھیالوجی کی ڈائریکٹر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ پھر چھ برس تک یونیورسٹی گرانٹس کمیشن حیدرآباد میں ریجنل ڈائریکٹر کے طور پر کام کیا۔ وہاں سے انہوں نے لیاقت لائبریری کراچی میں تبادلہ کرالیا۔ گورنمنٹ آف سندھ نے انہیں سیکرٹری، کلچر اینڈ یوتھ افیرز مقرر کیا۔ کچھ عرصے کے بعد انوائرنمینٹل پروٹیکشن ایجنسی میں ڈائریکٹر جنرل مقرر ہوئیں۔ ۲۰۰۵ء میں امیر پروفیشل کوآرڈی نیشن ڈیپارٹمنٹ میں سیکرٹری کے عہدے سے ریٹائر ہوئیں۔

پروفیسر ڈاکٹر فردوس انور قاضی

پروفیسر ڈاکٹر فردوس انور قاضی نے ۱۹۸۳ء میں بلوچستان یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ آپ ۱۹۷۵ء سے محکمہ تعلیم سے وابستہ ہیں۔ آج کل بلوچستان یونیورسٹی میں ڈین فیکلٹی آف لینگویجز اینڈ لٹریچر کے عہدہ پر فائز ہیں۔
آپ کی تصنیفات میں "اردو افسانہ نگاری کے رجحانات"، "خوابوں کی بستی" (ناول)، "آخری ٹرین"، "اردو شاعری کا ارتقاء" اور "جائزہ (نصابی کتاب)"، "اردو کے افسانوی اسالیب" شامل ہیں۔
آپ کو ۲۰۰۳ء میں بہترین استاد کے ایوارڈ سے نوازا گیا۔

پروفیسر ڈاکٹر خاطر غزنوی

پروفیسر ڈاکٹر خاطر غزنوی ملک کے معروف شاعر، نقاد اور محقق ہیں۔ ۱۹۶۲ء میں پشاور یونیورسٹی سے ایم۔اے اردو کیا اور گولڈ میڈل حاصل کیا۔ چین سے چینی زبان اور ملائشیا سے ملائی زبان میں ڈپلوما کیا۔ پنجاب یونیورسٹی سے پشتو زبان میں آنرز کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے علاوہ صوبہ سرحد سے میوزیکالوجی اور فارسی زبان میں سرٹیفکیٹ حاصل کیے۔
آپ ملائشیا کی ملایا یونیورسٹی میں شعبہ اردو اور مطالعہ پاکستان کے چیئرمین کے فرائض انجام دے چکے ہیں۔ ڈائریکٹر اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد، صدر شعبہ اردو، شعبہ چینی زبان پشاور یونیورسٹی رہے اور اس کے علاوہ مشیر ادبیات، اباسین آرٹس کونسل پشاور رہے۔ آج کل آپ مینجنگ ڈائریکٹر سنڈیکیٹ آف رائٹرز پشاور ہیں۔
آپ کی گراں قدر ادبی خدمات پر آپ کو صدر پاکستان نے تمغۂ حسن کارکردگی سے نوازا۔ تحقیق، قاموس ملایا یونیورسٹی پر خصوصی گرانٹ، شیلڈ اور متعدد فن پاروں پر ایوارڈ حاصل کیے۔ آپ کی مختلف موضوعات پر ۴۳ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ آپ کو بہت سے اخبارات و رسائل کی ادارت کا اعزاز حاصل ہے۔

عبدالحکیم بلوچ

عبدالحکیم بلوچ پنج گر مکران میں پیدا ہوئے۔ آپ مترجم، محقق، ڈرامہ نگار اور نثر نگار کے طور پر پہچانے جاتے ہیں۔ بہت سی بلوچی مطبوعات کو مرتب کیا۔ ۱۹۷۲ء میں مقابلے کا امتحان پاس کیا۔ آپ نے سیکرٹری لیبر، سیکرٹری انفارمیشن، سیکرٹری فوڈ، ہوم سیکرٹری، سینئر ممبر بورڈ آف ریونیو کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ ۱۴ دسمبر ۲۰۰۲ء میں ریٹائر ہو گئے۔ آپ کو

انگریزی، اردو، بلوچی اور فارسی زبانوں پر عبور حاصل ہے۔ مختلف ممالک کے دورے کر چکے ہیں آپ کی تخلیقات میں بلوچی کہانیوں کا مجموعہ ''شبیہ شاد''، انگریزی کہانیوں اور مضامین کا مجموعہ، ''آ سی چار'' بلوچی ڈراموں کا مجموعہ، ''سنگ گراں''، ''کنڈث''، ''ماتم دانش''، ''زیر سایہ خورشید''، اور ''بلوچی قومیت'' شامل ہیں، ملک کے مختلف اخبارات اور رسائل میں آپ کے مضامین شائع ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر عطش درانی

پاکستانی اردو، تحقیق، لغات و اصطلاحات، اردو اطلاعیات، خواندگی اور نصابیات کے حوالے سے ڈاکٹر عطش درانی ایک معروف نام ہے۔ پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج سے اردو میں پی ایچ ڈی، پنجاب یونیورسٹی ادارہ تعلیم و تحقیق سے ایجوکیشن میں ایم اے کیا۔ ماہنامہ ''کتاب'' اور ''سیارہ ڈائجسٹ'' سے لے کر ''اردو نامہ'' اور ''اخبار اردو'' کی ادارت اور نیشنل بک کونسل، مجلس زبان دفتری اور مقتدرہ قومی زبان میں ملازمتیں، پاکیڈ کے جرائد کی تدوین اور یونیسکو، ایشین ڈویلپمنٹ بنک، ورلڈ ایجوکیشن اور مائیکروسافٹ جیسے عالمی اداروں کے کنسلٹنٹ رہے۔ اردو کو ترقی کی منزلوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے بے شمار خدمات انجام دیں۔ سو سے زائد کتابوں اور دو سو سے زاید مقالوں میں اپنے تصورات پیش کیے۔ آج کل مقتدرہ قومی زبان میں مرکز فضیلت برائے اردو اطلاعیات کے پراجیکٹ ڈائریکٹر ہیں۔ ''پاکستانی اردو کے خدوخال''، ''اردو اصطلاحات سازی''، ''جدید رسمیات''، ''تحقیق''، ''تدریسیات اردو''، ''اسلامی فکر و ثقافت'' اور ''سلطان شہید'' جیسی علمی کتابوں کے ساتھ ساتھ اردو میں صاحب اسلوب خاکہ نگار کی حیثیت سے معروف ہیں۔

ڈاکٹر شاہین مفتی

ڈاکٹر شاہین مفتی اردو شعر و ادب کی ممتاز شخصیت ہیں۔ آپ نے ۱۹۷۵ء میں پنجاب یونیورسٹی سے اردو ادب میں ایم اے کیا۔ اور درس و تدریس کی زندگی اختیار کی۔ آپ کی شاعری کے مجموعے ''امانت''، ''مسافت'' اور ''پانی پر قدم'' چھپ چکے ہیں۔ آپ نے ''فیض کی شاعری میں رنگ کی اہمیت'' پر ایم فل کیا اور ''جدید اردو نظم میں وجودیت'' کے موضوع پر مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ آپ نے لاطینی ناول نگار ''آچے بے'' کے ناول "Man of the People" کا اردو ترجمہ ''آپ کا خادم'' کے نام سے اور عربی نظموں کا ترجمہ ''دشتِ رائیگانی'' کے نام سے شائع کیا۔ ''اردو ادب کا اینٹی ہیرو'' آپ کی تنقیدی کتاب ہے۔

آپ ان دنوں گورنمنٹ ابن امیر ڈگری کالج جلال پور جٹاں گجرات کی پرنسپل ہیں۔ ۱۹۹۴ء میں آپ کو امریکن بائیوگرافیکل سنٹر نے ''وومین آف دی ایئر'' کا یادگاری میڈل عطا کیا اور ۲۰۰۲ء میں آپ کو عالمی سطح کے ایجوکیٹر کی سندِ امتیاز عطا کی گئی۔

ظہیر جاوید

ظہیر جاوید ملک کے ایک ممتاز براڈ کاسٹر اور پروڈیوسر ہیں۔ آپ کو شعر و ادب کا ذوق اپنے والد مولانا چراغ حسن حسرت سے ملا۔ جو نامور صحافی، صاحب طرز ادیب اور منفرد مزاح نگار تھے۔ آپ نے ۱۹۵۶ء میں صحافت کا پیشہ اختیار کیا۔ روزنامہ ''آفاق''، ''امروز''، ''ندائے ملت''، ''آزاد'' اور ''مساوات'' ان کے پہلے دور کی منازل ہیں۔ ۱۹۷۲ء میں پاکستان ٹیلی ویژن نے آپ سے سپیشل ٹاسک فورس میں شمولیت کی درخواست کی۔ لیکن فروری ۱۹۷۸ء میں واپس صحافت میں آ گئے اور روزنامہ نوائے وقت ''دی مسلم''، ''فرنٹیئر پوسٹ''، ''پکار''، ''پاکستان'' اور ''دن'' کے ساتھ وابستگی اختیار کی۔ ۱۹۸۹ء میں آپ دوبارہ ٹیلی ویژن سے منسلک ہو گئے جہاں ایک عرصے تک آپ نے پاکستان ٹیلی ویژن اکیڈمی میں پروڈیوسروں کو پڑھایا بھی اور شعبہ نیوز میں اعلیٰ عہدوں پر کام بھی کیا۔ آپ دسمبر ۱۹۹۸ء میں ریٹائر ہو گئے۔ ٹیلی ویژن سے ریٹائر ہونے کے بعد آپ نے آزاد کشمیر، ریڈیو تراڑکھل سے کشمیر پر ایک ایسا پروگرام شروع کیا جس کی تعریف لوگوں نے تحریر اسری نگر تک سے کی۔

ظہیر جاوید نے فلسفے پر بھی کام کیا ہے ''مغرب کے سیاسی فلسفی'' آپ کی مقبول ترین کتاب ہے۔ آپ نے بچوں کے لیے دو کتابیں ''سیاہ سورج'' اور ''چاند کے مسافر'' لکھی ہیں۔ کشمیر پر ان کی کتاب ''پربتوں کی شہزادیاں'' زیر طباعت ہے۔ اس کے علاوہ ''پراسرار بندے'' اور ''جانے پہچانے لوگ'' بھی تیار ہو چکی ہیں۔

ڈاکٹر انور سدید

ڈاکٹر انور سدید سرگودھا کے ایک متوسط گھرانے کے فرد ہیں۔ ابتدائی تعلیم سرگودھا اور ڈیرہ غازی خان کے سکولوں میں حاصل کی اور انجینئرنگ کے شعبہ سے وابستہ ہو گئے۔ ۱۹۸۸ء میں ایگزیکٹو انجینئر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ آپ کو طالب علمی کے زمانہ میں ہی ادب سے عشق پیدا ہو گیا تھا۔ پنجاب یونیورسٹی کے ایم اے اردو کے امتحان میں اول آئے اور طلائی تمغہ حاصل کیا۔ ''اردو ادب کی تحریکیں'' کے موضوع پر مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد آپ نے صحافت کا پیشہ اختیار کیا اور متعدد کتابیں لکھیں۔ ''پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ''، ''اردو ادب میں انشائیہ''، ''اردو ادب میں سفر نامہ''، ''برسبیل تنقید''، ''اردو افسانے کی کروٹیں''، ''اردو نثر کے آفاق''، ''اردو افسانے میں دیہات کی پیشکش''، ''میر انیس کی قلمرو''، ''اقبال کے کلاسیکی نقوش''، ''غالب کا جہاں اور'' اور ''اردو ادب کی مختصر تاریخ'' ان کی چند مقبول کتابوں کے نام ہیں۔ آپ پچاس سے زیادہ کتابوں کے مصنف اور مؤلف ہیں۔ آپ کی کئی کتابوں پر قومی ایوارڈز مل چکے ہیں۔

ڈاکٹر انور سدید ان دنوں روزنامہ ''نوائے وقت'' کے ساتھ وابستہ ہیں اور رسالہ ''مخزن'' کی مجلس ادارت کے رکن بھی ہیں۔